بصائر وعبر

نصرت الٰہی سے محرومی کے اسباب!

سعید احمد جلال پوری

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

گزشتہ دنوں روزنامہ جنگ کراچی کے توسط سے جناب ندیم احمد کراچی کا ایک مختصر مگر چبھتا ہوا سوال موصول ہوا کہ:

”آج کل پوری دنیا میں مسلمانوں پر ظلم ہورہا ہے اور یہ ظلم کرنے والے غیر مسلم ہیں تو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی مدد کیوں نہیں آتی؟“

بلاشبہ یہ سوال آج کل تقریباً ہر دین دار مسلمان کی زبان پر ہے اور اس کے دل و دماغ کو پریشان کئے ہوئے ہے اور اسے سمجھ نہیں آتا کہ اگر مسلمان حق پر ہیں اور یقیناً حق پر ہیں، تو ان کی مدد کیوں نہیں کی جاتی اور ان کے اعداء و مخالفین یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین، جو یقیناً باطل پر ہیں، کے خلاف اللہ تعالیٰ کا جوش انتقام حرکت میں کیوں نہیں آتا؟ اور ان کو تہس نہس کیوں نہیں کردیا جاتا؟ یا کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو مسلمانوں پر فوقیت و برتری کیونکر حاصل ہے؟ اور ان کو اس قدر ڈھیل کیوں دی جارہی ہے؟ اس کے برعکس مسلمانوں کو روز بروز ذلت و ادبار کا سامنا کیونکر ہے؟

اس سوال کے جواب میں راقم الحروف نے جو کچھ لکھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے قارئین بینات کی خدمت میں پیش کردیا جائے، ملاحظہ ہو:

برادر عزیز! آپ کا سوال معقول اور بجا ہے، کیونکہ اس وقت دنیا بھر میں مسلمانوں پر جس قدر مظالم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں اور مسلمان جس قدر ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں، شاید ہی کسی دوسری قوم پر کبھی ایسا وقت آیا ہو؟ اس سب کے باوجود مسلمانوں کے حق میں اللہ کی مدد کا نہ آنا، واقعی قابل تشویش ہے، اور آپ کی طرح ہر مسلمان اس تشویش میں مبتلا ہے۔

لہٰذا آپ کے سوال کے جواب کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا، اگر آپ نے ان کو ذہن نشین کرلیا تو امید ہے کہ انشاء اللہ آپ کو مسلمانوں کے حق میں اللہ کی مدد نہ آنے کے اسباب و وجوہ سمجھ آجائیں گے۔

دراصل یہاں دو امور ہیں، ایک یہ کہ تمام مسلمان عموماً اللہ تعالیٰ کی مدد سے کیوں محروم ہیں؟ دوسرے یہ کہ خاص طور پر وہ نیک صالح مسلمان، جو واقعی اللہ تعالیٰ کے دین کے محافظ ہیں، ان پر مصائب و بلایا کے پہاڑ کیوں توڑے جارہے ہیں؟ ان کے حق میں اللہ کی مدد آنے میں تاخیر کیوں ہورہی ہے؟ اور ان کے دشمنوں کو اس قدر ڈھیل کیوں دی جارہی ہے؟

اول: سب سے پہلے یہ کہ تمام مسلمان اللہ کی مدد سے کیوں محروم ہیں؟ اس سلسلہ میں عرض ہے:

۱:...... اس وقت مسلمان من حیث القوم مجموعی اعتبار سے تقریباً بدعملی کا شکار ہو چکے ہیں۔

۲:......اس وقت مسلمانوں میں ذوقِ عبادت اور شوقِ شہادت کا فقدان ہے، بلکہ مسلمان بھی... الا ماشاءاللہ... کفار و مشرکین کی طرح موت سے ڈرنے لگے ہیں۔

۳:......اس وقت تقریباً مسلمانوں کو دین، مذہب، ایمان، عقیدہ سے زیادہ اپنی، اپنی اولاد اور اپنے خاندان کی دنیاوی راحت وآرام کی فکر ہے۔

۴:......آج کل مسلمان... الا ماشاءاللہ... موت، مابعد الموت، قبر، حشر، آخرت، جہنم اور جنت کی فکر واحساس سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور انہوں نے کافر اقوام کی طرح اپنی کامیابی و ناکامی کا مدار دنیا اور دنیاوی اسباب و ذرائع کو بنالیا ہے، اس لئے تقریباً سب ہی اس کے حصول و تحصیل کے لئے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں۔

۵:......اس وقت... الا ماشاءاللہ... مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد، بھروسہ اور توکل نہیں رہا، اس لئے وہ دنیا اور دنیاوی اسباب و وسائل کو سب کچھ باور کرنے لگے ہیں۔

۶:......جب سے مسلمانوں کا اللہ کی ذات سے رشتہ عبدیت کمزور ہوا ہے، انہوں نے عبادات و اعمال کے علاوہ قریب قریب سب ہی کچھ چھوڑ دیا ہے، حتیٰ کہ بارگاہ الٰہی میں رونا، بلبلانا اور دعائیں مانگنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

۷:......جس طرح کفر وشرک کے معاشرہ اور بے خدا قوموں میں بدکرداری، بدکاری، چوری، ڈکیتی، شراب نوشی، حرام کاری، حرام خوری، جبر، تشدد، ظلم اور ستم کا دور دورہ ہے، ٹھیک اسی طرح نام نہاد مسلمان بھی ان برائیوں کی دلدل میں سرتاپا غرق ہیں۔

۸:......معدودے چند، اللہ کے جو بندے، اس غلاظت کدہ میں نور کی کرن اور امید کی روشنی ثابت ہو سکتے تھے، ان پر اللہ کی زمین تنگ کردی گئی، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان قرآن وسنت، دین و مذہب کی پاسداری اور اسوۂ نبوت کی راہ نمائی میں زندگی گزارنا چاہتے تھے، انہیں تشدد پسند، دہشت گرد، رجعت پسند اور ملک وملت کے دشمن وغیرہ کہہ کر ٹھکانے لگا دیا گیا۔

۹:...... نام نہاد مسلمانوں نے کافر اقوام کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوکر اور ان کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے کر دین و مذہب سے وابستگی رکھنے والے مخلصین کے خلاف ایسا طوفان بدتمیزی برپا کیا اور ان کو اس قدر مطعون و بدنام کیا کہ کوئی سیدھا سادا مسلمان، اسلام اور اسلامی شعائر کو اپناتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔

۱۰:......اسلام دشمن میڈیا، اخبارات، رسائل وجرائد میں اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر خطرناک، نقصان دہ، ملک وملت دشمن اور امن مخالف باور کرایا گیا کہ اب خود مسلمان معاشرہ ان کو اپنانے اور گلے لگانے پر آمادہ نہیں۔

۱۱:...... مادیت پسندی نے نام نہاد مسلمان کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ اب اس کو حلال وحرام کی تمیز تک نہیں رہی، چنانچہ .... الا ماشاءاللہ.... اب کوئی مسلمان حلال وحرام کی تمیز کرتا ہو، اس لئے مسلم معاشرہ میں بھی، سود، جوا، رشوت، لاٹری، انعامی اسکیموں کا دور دورہ ہے۔

۱۲:...... جولوگ سودخوری کے مرتکب ہوں، اللہ تعالیٰ کا ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ظاہر ہے جو مسلمان سودخور ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے حالت جنگ میں ہیں، اور جن لوگوں سے اعلانِ جنگ ہو، کیا ان کی مدد کی جائے گی؟

۱۳:...... جو معاشرہ عموماً چوری ڈکیتی، ماردھاڑ، اغوا برائے تاوان، جوئے، لاٹری، انعامی اسکیموں اور رشوت پر پل رہا ہو، اور جہاں ظلم وتشدد عروج پر ہو، جہاں کسی غریب کی عزت و ناموس اور مال و دولت محفوظ نہ ہو، وہاں اللہ کی رحمت نازل ہوگی یا اللہ کا غضب؟ پھر یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ کفر کے ساتھ حکومت چل سکتی ہے، مگر ظلم کے ساتھ نہیں چل سکتی، اس لئے کہ اللہ کی مدد مظلوم کے ساتھ ہوتی ہے۔ چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو اور ظالم چاہے مسلمان ہی کیوں نہ ہو، اللہ کی مدد سے محروم ہوتا ہے۔

۱۴:...... جس قوم اور معاشرہ کی غذا، لباس، گوشت، پوست حرام مال کی پیداوار ہوں، ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

”عن ابی ہریرۃؓ قال: قال رسول الله ﷺ: ان الله طیب لا یقبل الا طیباً، وان الله امر المؤمنین بماامربه المرسلین فقال: ”یاایها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا“ وقال تعالیٰ: ”یا ایها الذین آمنوا کلوا من طیبات مارزقناکم“ ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیه الیٰ السماء یارب، یارب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذی بالحرام فانیٰ یستجاب لذالک، رواه مسلم.“ (مشکوٰۃ، ص:۲۴۱)

ترجمہ:...”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پاک، پاکیزہ ہیں اور پاک، پاکیزہ ہی قبول فرماتے ہیں، اور بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی وہی حکم دیا ہے جو رسولوں کو حکم دیا تھا، پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اے رسولوں کی جماعت پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور اعمال صالحہ کرو“ اسی طرح مومنوں سے فرمایا: ”اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کی وجہ سے غبار آلود اور پراگندہ بال ہے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر کہتا ہے: اے رب! اے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام کا، پینا حرام کا، لباس حرام کا اور اس کی غذا حرام کی ہے، تو اس کی دعا کیونکر قبول ہوگی؟“

۱۵:...... بایں ہمہ وہ مقبولانِ الٰہی، جو مخلوق خدا کی اس مجبوری اور مقہوری پر کڑھتے ہیں، روتے ہیں، بلبلاتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے بارگاہِ الٰہی میں دعائیں کرنا چاہتے ہیں، ان کو بارگاہِ الٰہی سے یہ کہہ کر روک دیا جاتا ہے کہ اپنی ذات کے لئے اور اپنی ضرورت کے لئے دعا کرو، میں قبول کروں گا لیکن عام لوگوں کے حق میں تمہاری دعا قبول نہیں کروں گا۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

”عن انس بن مالکؓ اراہ مرفوعاً قال: یأتی علی الناس زمان یدعو المؤمن للجماعة فلایستجاب له، یقول الله: ادعنی لنفسک ولمایحزبک من خاصة امرک

فاجیبک، واماالجماعة فلا!انهم اغضبونی. وفی روایة:فانی علیهم غضبان.“
(کتاب الرقائق ص:۱۵۵،۳۸۴)

ترجمہ:...”حضرت انس رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا دور آئے گا کہ مومن، مسلمانوں کی جماعت کے لئے دعا کرے گا، مگر قبول نہیں کی جائے گی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، تو اپنی ذات کے لئے اور اپنی پیش آمدہ ضروریات کے لئے دعا کر، میں قبول کروں گا،لیکن عام لوگوں کے حق میں قبول نہیں کروں گا،اس لئے کہ انہوں نے مجھے ناراض کرلیا ہےاورایک روایت میں ہے کہ میں ان سے ناراض ہوں۔“

۱۶:......پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ آسمان سے اچھے یا بُرے فیصلے اکثریت کے عمل اور بدعملی کے تناظر میں نازل ہوتے ہیں، اس لئے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلم معاشرہ کی اکثریت کے اعمال وافعال اور سیرت وکردار کا کیا حال ہے؟ کیا ایسا معاشرہ جہاں دین، دینی اقدار کا مذاق اڑایا جاتا ہو، جہاں قرآن وسنت کا انکار کیا جاتا ہو، جہاں اس میں تحریف کی جاتی ہو، جہاں ان کو من مانے مطالب، مفاہیم اور معانی پہنائے جاتے ہوں، جہاں حدود اللہ کا انکار کیا جاتا ہو، جہاں سود کو حلال اور شراب کو پاک کہا جاتا ہو، جہاں زناکاری وبدکاری کو تحفظ ہو، جہاں ظلم وتشدد کا دور دورہ ہو، جہاں مسلمان کہلانا دہشت گردی کی علامت ہو، جہاں بےقصور معصوموں کو کافر اقوام کے حوالہ کیا جاتا ہو، جہاں بدکار و مجرم معزز اور معصوم ذلیل ہوں، جہاں توہین رسالت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا جاتا ہو، جہاں باغیانِ نبوت کو اقتدار کی چھتری مہیا ہو، جہاں محافظین دین وشریعت کو پابند سلاسل کیا جاتا ہو، جہاں کلمہ حق کہنے والوں کو گولیوں سے چھلنی کیا جاتا ہو، جہاں کافر اقوام کی کاسہ لیسی کی جاتی ہو، جہاں یہود و نصاریٰ کی خوشنودی کے لئے مسلم ممالک پر اسلام دشمنوں کی چڑھائی کو سند جواز مہیا کی جاتی ہو، جہاں دینی مدارس ومساجد پر چڑھائی کی جاتی ہو،ان پر بمباری کی جاتی ہو، ہزاروں معصوموں کو خاک وخون میں تڑپایا جاتا ہو،ان پر فاسفورس بم گراکر ان کا نام ونشان مٹایا جاتا ہو، جہاں مسلمان طالبات اور پردہ نشین خواتین کو درندگی کا نشانہ بنایا جاتا ہو،ان کی لاشوں کی بےحرمتی کی جاتی ہو،ان کے جسم کے چیتھڑے اڑائے جاتے ہوں،ان کو دفن کرنے کے بجائے ان کی لاشوں کو جلایا جاتا ہو، جہاں تاتاری اور نازی مظالم کی داستانیں دہرائی جاتی ہوں، جہاں دین دار طبقہ اور علماء وصلحاء پر زمین تنگ کی جاتی ہو، جہاں اغیار کی خوشنودی کے لئے اپنے شہریوں کے خلاف آپریشن کلین اپ کئے جاتے ہوں، جہاں ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نقل مکانی پر مجبور کیا جاتا ہو، جہاں دین وشریعت کا نام لینا جرم اور عریانی فحاشی، پتنگ بازی اور میراتھن ریس کی سرپرستی کی جاتی ہو، جہاں عریانی وفحاشی کو روشن خیالی و اعتدال پسندی کا نام دیا جاتا ہو، جہاں دینی مدارس بند اور قحبہ خانے کھولے جاتے ہوں، جہاں عوام نانِ شبینہ کے محتاج ہوں اور اربابِ اقتدار ۲۰/۲۰ لاکھ روپے ایک رات ہوٹل کے قیام کا کرایہ ادا کرتے ہوں، جہاں اپنے اقتدار اور حکومت کے تحفظ کے لئے دین ومذہب اور شرم وحیاء کی تمام حدود کو پھلانگا جاتا ہو، وہاں اللہ کی رحمت نازل ہوگی؟ یا اللہ کا عذاب وعقاب؟؟؟

بلاشبہ آج کا دور دجالی فتنے اور نئے نئے نظریات کا دور ہے، زمانہ بوڑھا ہو چکا، ہم جنس پرستی کو قانونی جواز حاصل ہو چکا، ناچ گانے کی محفلیں عام ہو چکیں، دیکھا جائے تو یہ قرب قیامت کا وقت ہے، اس وقت مسلمانوں سے اللہ کی حفاظت ومدد اٹھ چکی

ہے،مسلمانوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں، سچی بات یہ ہے کہ یہ اللہ کی ناراضگی، ظاہرداری، چاپلوسی، انانیت،خود پسندی اور امت کے زوال کا وقت ہے، فتنہ وفساد عروج پر ہیں، خیر سے محروم لوگوں کی کثرت ہے اور خدا کی لعنت وغضب کا وقت ہے، اور یہود و نصاریٰ کی نقالی کامیابی کی معراج شمار ہونے لگی ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایسے لوگوں اور معاشرہ کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے؟ چنانچہ ایسے ہی دور کے لوگوں کے بارہ میں حدیث شریف میں ہے کہ:

”عن مرداس الاسلمیؓ قال النبی ﷺ :یذھب الصالحون الاول فالاول ،وتبقیٰ حفالة کحفالة الشعیر اوالتمر لایبالیھم الله بالة.“

(صحیح بخاری کتاب الرقائق،

ص:۹۵۲،ج:۲)

ترجمہ:...”حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک لوگ یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جائیں گے، جیسے چھٹائی کے بعد ردی جو یا کھجوریں باقی رہ جاتی ہیں، ایسے ناکارہ لوگ رہ جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔“

۱۷:...... اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ: مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد کا وعدہ ضرور ہے لیکن ساتھ ہی اللہ کی مدد آنے کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ:

”یاایھاالذین آمنوا ان تنصروا الله ینصرکم ویثبت اقدامکم“ (محمد:۷)

ترجمہ:...”اگر تم اللہ کے دین کی مدد کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے، اور تمہارے قدموں کو ثابت کریں گے۔“

لہٰذا جب سے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد چھوڑ دی ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں سے اپنی رحمت وعنایت اور مدد کا ہاتھ اٹھالیا ہے، چنانچہ آج ہر طرف مسلمانوں پر کافر اس طرح ٹوٹ رہے ہیں جس طرح دسترخوان پر چنے ہوئے کھانے پر لوگ ٹوٹتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عن ثوبانؓ قال:قال رسول الله ﷺ : یوشک الامم ان تداعیٰ علیکم کماتداعیٰ الآکلة الیٰ قصعتھا، فقال قائل:ومن قلة نحن یومئذٍ؟ قال:بل انتم یومئذٍ کثیر! ولکنکم غثاء کغثاء السیل، ولینزعن الله من صدور عدوکم المھابة منکم ،ولیقذفن الله فی قلوبکم الوھن!فقال قائل:یارسول الله!وماالوھن؟قال: حب الدنیاوکراھیة الموت!“ (ابوداوٴد ص:۵۹)

ترجمہ:...”حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ وقت قریب آتا ہے، جب تمام کافر قومیں تمہارے مٹانے کے لئے.... مل کر سازشیں کریں گی.... اور ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے دسترخوان پر کھانا کھانے والے.... لذیذ.... کھانے کی طرف ایک دوسرے کو بلاتے ہیں، کسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوگا؟

فرمایا:نہیں! بلکہ تم اس وقت تعداد میں بہت ہوگے، البتہ تم سیلاب کی جھاگ کی طرح ناکارہ ہوگے، یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا رعب اور دبدبہ نکال دیں گے، اور تمہارے دلوں میں بزدلی ڈال دیں گے، کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ! بزدلی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔''

بتلایا جائے جس معاشرہ کا یہ حال ہو، اور جن مسلمانوں کے اعمال واخلاق کا یہ منظر نامہ ہو، وہاں اللہ کی مدد آئے گی یا اللہ کا عذاب؟

....

دوم: رہی یہ بات کہ کفار ومشرکین اور اغیار کے مظالم کا شکار صرف اور صرف دین دار مسلمان ہی کیوں ہیں؟

اگر بدکردار مسلمانوں اور اربابِ اقتدار نے اللہ کو ناراض کررکھا ہے تو ان کی سزا ان نہتے معصوموں کو کیوں دی جاتی ہے؟ اور ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی مدد کیوں نہیں آتی؟ چاہئے تو یہ تھا کہ جرم وسزا کے فلسفہ کے تحت سزا بھی ان ہی لوگوں کو دی جاتی، جنہوں نے اللہ کو ناراض کررکھا ہے، مگر اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ نیک صالح مسلمان، اور دین ومذہب کے متوالے، کفار کے مظالم کی تلوار سے ذبح ہورہے ہیں، ان کو بے نام کیا جارہا ہے، ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جارہا ہے، ان کی جان ومال اور عزت وناموس برباد کی جارہی ہے، ان پر اللہ کی زمین تنگ کی جارہی ہے، اپنے اور پرائے سب ہی ان کے دشمن اور ان کی جان کے پیاسے ہیں، کوئی بھی ان کے لئے کلمہ خیر کہنے کا روادار نہیں ہے، بلکہ ان پر ہر طرف سے آگ وآہن کی بارش اور بارود کی یلغار ہے، آخر ایسا کیوں ہے؟؟

اسی طرح ارشاد الٰہی: ''الا ان نصر اللّٰہ قریب'' ...بے شک اللہ کی مدد قریب ہے... کا وعدہ کب پورا ہوگا؟

اس سلسلہ میں بھی چند معروضات پیش کرنا چاہوں گا:

۱:......دنیا با خدا مسلمانوں کے لئے قید خانہ اور کفار ومشرکین کے لئے جنت ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

''عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

''الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر'' (ترمذی ص:۵۶ ج:۲)

ترجمہ:......''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔''

یعنی دنیا میں عموماً کافر کی نسبت، ایک مومن کو آفات ومصائب کا سامنا زیادہ کرنا پڑتا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ کافر کی دنیاوی کروفر اور راحت وآرام اور مومن کی تکلیف وتعذیب کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا چاہئے، بلکہ مومن کی دنیا کی تکلیف وتعذیب اور مصائب وآلام کا، اس کی جنت کے ساتھ اور کافر کی ظاہری کروفر، خوش عیشی اور راحت وآرام کا اس کی جہنم کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو سمجھ آجائے گا کہ جس طرح کافر کی دنیاوی راحت وآسائش کی، اس کی جہنم کی سزا کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں، اسی طرح مسلمان کی دنیا کی عارضی تکالیف ومشکلات اس کی جنت اور آخرت کی راحت وآرام کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔

۲:......دنیا دار العمل اور آخرت دار الجزا ہے اور ظاہر ہے جو شخص عملی میدان میں جتنا محنت ومشقت اور جہد ومجاہدہ برداشت

کرے گا، بعد میں اسی تناسب سے اسے راحت و آرام میسر آئے گا اور جو شخص میدانِ عمل میں جتنا کوتاہی کرے گا، بعد میں اسی تناسب سے اُسے ذلت و رسوائی اور فضیحت و شرمندگی کا سامنا کرنا ہوگا، ٹھیک اسی طرح مقربین بارگاہِ خداوندی کو بھی آخرت کی کھیتی یعنی دنیا میں جہد مسلسل اور محنت و مشقت کا سامنا ہے، مگر عاقبت و انجام کے اعتبار سے جلد یا بدیر راحت و آرام ان کا مقدر ہوگا، دوسری طرف کافر اگرچہ یہاں ہر طرح کی راحت و آرام سے سرفراز ہیں، مگر مرنے کے ساتھ ہی عذاب جہنم کی شکل میں ان کی راحت و آرام اور ظلم و عدوان کا ثمرہ ان کے سامنے آجائے گا۔

۳:...... کسی مسلمان کی تخلیق کا مقصد دنیا اور اس کی راحتوں کا حصول نہیں، بلکہ مسلمان کو جنت اور جنت کی لازوال و ابدی نعمتوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جنت کا حصول کچھ آسان نہیں، بلکہ جنت کے سامنے یا اردگرد مشکلات و مصائب کی باڑھ لگائی گئی ہے اور دوزخ کے اردگرد خواہشات کی باڑھ کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

”عن انس رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: حفت الجنة بالمکاره وحفت النار بالشهوات.“ (ترمذی ص:۸۰ ج:۲)

ترجمہ:...... ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے گرد ناگواریوں اور مشقتوں کی باڑھ کی گئی ہے، اور دوزخ کے گرد خواہشات کی باڑھ کی گئی ہے۔“

اس لئے کسی نیک صالح مسلمان کا دنیا میں مشکلات و مصائب اور مکروہات سے دوچار ہونا دراصل حصولِ جنت میں کامیابی کی نشانی ہے، اور کفار و مشرکین اور معاندین کے لئے دنیاوی راحت و آرام یا خواہشات نفسانیہ کا مہیا ہونا ان کے عذابِ نار و سقر سے دوچار ہونے کی علامت ہے۔

۴:...... بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آخرت کے عذاب سے بچانے کے لئے دنیا ہی میں انہیں مصائب و تکالیف میں مبتلا فرماتے ہیں، تاکہ اس کی کمی کوتاہیوں کا معاملہ یہیں نمٹ جائے اور آخرت میں ان کو کسی عذاب سے دوچار نہ ہونا پڑے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عن انسؓ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا اراد اللّٰه بعبده الخیر عجل له العقوبة فی الدنیا، واذا اراد اللّٰه بعبده الشر امسک عنه بذنبه حتی یوافی به یوم القیامة۔

وبهٰذا الاسناد عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: ان عظم الجزاء مع عظم البلاء، وان اللّٰه اذا احب قوماً ابتلاهم، فمن رضی فله الرضا ومن سخط فله السخط.“

(ترمذی، ص:۶۲، ج:۲)

ترجمہ:...... ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، تو دنیا میں ہی اس کو فوری سزا دے دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہ کی سزا موخر کردیتے ہیں،

یہاں تک کہ قیامت کے دن اس کو پوری سزا دیں گے۔

نیز آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے کو جتنا بڑا ابتلاء پیش آئے، اتنی بڑی جزا اس کو ملتی ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت فرماتے ہیں تو اسے ... مصائب و آلام سے ... آزماتے ہیں، پس جو شخص ... ہر حالت میں اللہ تعالیٰ سے ... راضی رہا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے اور جو شخص ناراض ہوا اس کے لئے ناراضی ہے۔''

اس حدیث کی تشریح میں حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ لکھتے ہیں:

''اس حدیث میں دو مضمون ارشاد ہوئے، ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی سزا دنیا ہی میں دے دیتے ہیں، اس کی سزا کو آخرت پر نہیں اٹھا رکھتے، بلکہ مختلف مصائب میں اس کو مبتلا کر کے پاک و صاف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر اس کو کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ بھی اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، اور اگر لکھنے والے کے ہاتھ سے قلم گر جاتا ہے تو وہ بھی اس کے لئے کفارہ بن جاتا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ کسی بندۂ مومن کو کوئی تکلیف اور صدمہ یا پریشانی پیش آئے اسے اپنے گناہوں کا خمیازہ سمجھنا چاہئے۔ دوسری یہ کہ بندۂ مومن کا مصائب و آلام میں مبتلا ہونا اس کے مردود ہونے کی علامت نہیں، بلکہ اس کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ کا لطف و انعام ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اس کے گناہوں کے کفارہ کا دنیا ہی میں انتظام فرما دیا۔

اس کے برعکس جس بندے کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے گناہوں کے باوجود ڈھیل اور مہلت دیتے ہیں، وہ احمق یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں بہت معزز ہے حالانکہ اس کے ساتھ مکر و استدراج کا معاملہ ہو رہا ہے کہ اس کی معصیتوں اور نافرمانیوں کے باوجود اسے ڈھیل دی جا رہی ہے، اور قیامت کے دن جب بارگاہِ خداوندی میں پیش ہوگا، اسے اس کی بدعملیوں کا پورا پورا بدلہ چکا دیا جائے گا، الا یہ کہ حق تعالیٰ شانہ محض اپنے فضل و احسان سے عفو و درگزر کا معاملہ فرمائے... بشرطیکہ وہ مسلمان ہو کیونکہ کفر و شرک کی معافی نہیں ہے... ناقل۔

اس حدیث پاک سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی حق تعالیٰ شانہ کا لطف قہر کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی قہر لطف کی شکل میں، اس نکتہ کو حضرات عارفین خوب سمجھتے ہیں، ورنہ عام لوگوں کی نظر اس پر نہیں جاتی۔''

(دنیا کی حقیقت ص: ۱۹۷، ۱۹۸، ج: ۱)

۵:...... دنیا کا اصول ہے کہ جس سے زیادہ تعلق خاطر ہو یا جس کو کسی لائق بنانا ہو، اس کو کڑی آزمائش و امتحان سے گزارا جاتا ہے، اور اس کی چھوٹی چھوٹی حرکت و سکون پر گرفت کی جاتی ہے، چنانچہ اسی موقع پر فرمایا گیا ہے کہ: ''**حسنات الابرار سیئات المقربین**''... ابرار کی نیکیاں مقربین کی سیئات شمار ہوتی ہیں... یعنی مقربین کا مقام اتنا اونچا ہے کہ جو کام ابرار کریں اور وہ نیکی کہلائے، اگر وہی کام مقربین کریں تو ان کے درجہ کے اعتبار سے وہ بھی سیۂ اور گناہ شمار ہوتا ہے، گویا نیک و صالح مسلمان درجہ قرب

الٰہی پر فائز ہیں اور ان کو آخرت میں جن مراتبِ عالیہ سے سرفراز کرنا ہے، دنیاوی تکالیف ومشکلات کی بھٹی میں ڈال کر ان کو کندن بنانے کی سعی کی جارہی ہے۔

۶:......جس کا جتنا اللہ تعالیٰ سے قرب ہوگا اس کو اسی تناسب سے مصائب و بلایا اور شدائد ومحن سے دوچار کیا جائے گا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عن مصعب بن سعد عن ابیه قال قلت، یا رسول الله! ای الناس اشد بلاءً؟ قال: الانبیأ ثم الأمثل فالأمثل، فیتبلیٰ الرجل علیٰ حسب دینه فان کان فی دینه صلباً اشتد بلائه، وان کان فی دینه رقة ابتلی علی حسب دینه، فما یبرح البلاء بالعبد حتی یترکه یمشی علی الارض وما علیه خطیئة۔“

(ترمذی، ج:۲،ص:۶۲)

ترجمہ:......”حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! سب سے زیادہ آزمائش کس کی ہوتی ہے؟ فرمایا: انبیاء علیہم السلام کی، پھر جوان سے قریب تر ہو، پھر جوان سے قریب تر ہو، آدمی کو اس کے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے، پس اگر وہ اپنے دین میں پختہ ہوتو اس کی آزمائش بھی کڑی ہوتی ہے، اگر اس کے دین میں کمزوری ہوتو اسے اس کے دین کی بقدر آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، پس آزمائش بندے کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے، یہاں تک کہ اس کو ایسا کر کے چھوڑتی ہے کہ وہ زمین پر ایسی حالت میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں رہتا۔“

اس لئے موجودہ کیا، ہمیشہ سے مصائب ومشکلات اور شدائد ومحن اللہ کے مقربین کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

۷:......بعض اوقات مقربین بارگاہِ الٰہی کے پیمانۂ خلوص، اخلاص، صبر، تحمل، تسلیم، رضا، عزم، ہمت، دینی پختگی اور تصلّب کو ناپنے کے لئے ان پر امتحانات وآزمائشیں آتی ہیں، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

الف:...... **”ولنبلونکم بشئی من الخوف والجوع ونقص من الاموال والأنفس والثمرات، وبشر الصابرین، الذین اذا اصابتهم مصیبة قالوٓا انالله وانا الیه راجعون**

(البقرہ:۱۵۵)

ترجمہ:......”اور ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے۔ اور آپؐ ایسے صابرین کو بشارت سنادیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں۔“

ب:......**”الٓمّٓ، احسب النّاس ان یترکوا ان یقولوا آمنّا وهم لایفتنون، ولقد فتنّا الّذین من قبلهم فلیعلمنّ اللّٰه الّذین صدقوا ولیعلمنّ الکٰذبین۔“**

(عنکبوت:۱،۲،۳)

ترجمہ:......’’کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ، کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے، اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے، سو البتہ معلوم کرے گا اللہ جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹوں کو۔‘‘

ج:......’’عن خباب بن الارت قال: شکونا الی النّبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم وهو متوسّد بردۃً له فی ظلّ الکعبة فقلنا: الا تستنصرلنا، الا تدعو اللّٰہ لنا؟ قال کان الرّجل فی من قبلکم یحفرله فی الارض فیجعل فیها فیجاء بالمنشار فیوضع علٰی رأسه فیشق باثنین وما یصدّہ عن دینه، ویمشط بامشاط الحدید مادون لحمه من عظم او عصب وما یصدہ ذلک عن دینه...‘‘ (صحیح بخاری،ص:۵۱۰،ج:۱)

ترجمہ:......’’حضرت خباب بن الارتؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے سائے میں اپنی چادر سے ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے، کہ ہم نے آپؐ سے... کفار کے مظالم کی شکایت کرتے ہوئے... عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ ہمارے لئے اللہ سے مدد اور دعا کیوں نہیں مانگتے؟... آپؐ یہ سن کر ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے... اور فرمایا: تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک شخص کے لئے گڑھا کھودا جاتا، اسے اس میں کھڑا کیا جاتا اور اس کے سر پر آری چلا کر اسے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا، مگر یہ سب کچھ اس کو اس کے دین سے نہ ہٹا سکا، اسی طرح کسی کے جسم پر لوہے کی کنگھی چلا کر اس کا گوشت اور پٹھے اس کی ہڈیوں سے اُدھیڑ دیئے جاتے، مگر یہ سب کچھ اس کو اس کے دین سے نہیں ہٹا سکتا۔‘‘

گویا ان حضرات کو اپنے دین و مذہب کی خاطر اس قدر اذیتیں دی گئیں اور انہوں نے اس پر صبر و برداشت کیا تو تمہیں بھی ان معمولی تکالیف پر حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے بلکہ صبر و برداشت سے کام لینا چاہئے اور اللہ کی نصرت و مدد پر نگاہ رکھنی چاہئے جلد یا بدیر اللہ کی مدد آ کر رہے گی۔

۸:......اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے مقربین کو تکالیف و مصائب سے دوچار کر کے دراصل ان کی نیکیوں اور اعمالِ حسنہ کا پورا پورا بدلہ اور جزا دنیا کے بجائے آخرت میں دینا چاہتے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

’’یود اهل العافیة یوم القیامة حین یعطی اهل البلاء الثواب لو ان جلودهم کانت قرضت فی الدنیا بالمقاریض۔‘‘ (ترمذی ص:۶۳ ج:۲)

ترجمہ:......’’قیامت کے دن جب اہلِ مصائب کو بدلہ عطا کیا جائے گا تو اہلِ عافیت... جو ان مصیبتوں سے محفوظ رہے... یہ آرزو کریں گے کہ کاش! دنیا میں ان کے چمڑے قینچیوں سے کاٹ دیئے جاتے۔‘‘

۹:...... بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد اور نصرت پر قادر ہے، وہ چاہے تو کسی عام مظلوم کی مدد کے لئے آسمان سے فرشتے نازل کر سکتا ہے اور نہ چاہے تو بنی اسرائیل جیسی ناہنجار قوم کے ہاتھوں اپنے مقرب و مقدس انبیاء علیہم السلام کو جامِ شہادت

نوش کرادے، مگر بایں ہمہ خدا پرست اور اہلِ حق نہ دل چھوٹا کرتے ہیں اور نہ مایوس و بزدل ہوتے ہیں؟ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:.

الف:......"ویقتلون النبیین بغیر الحق "(البقرہ:۶۱)... اور وہ بنی اسرائیل... خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق...

ب:......"ویقتلون الانبیاء بغیر حق، ذالک بما عصوا و کانوا یعتدون "(آل عمران:۱۱۲)... اور قتل کرتے رہے ہیں پیغمبروں کا ناحق، یہ اس واسطے کہ نافرمانی کی انہوں نے اور حد سے نکل گئے...

ج:......"وکأیّن من نبی قٰتل معه ربیّون کثیر فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل الله وما ضعفوا وما استکانوا والله یحبُّ الصّابرین۔" (آل عمران:۱۴۶)

ترجمہ:...... "اور بہت نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر لڑتے ہیں بہت خدا کے طالب، پھر نہ ہارے ہیں کچھ تکلیف پہنچنے سے، اللہ کی راہ میں اور نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دب گئے ہیں اور اللہ محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے۔"

۱۰:......ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد فوراً آجائے، بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی مدد و نصرت میں بھی اتنی تاخیر فرما سکتے ہیں کہ وہ مایوسی کے قریب ہو جائیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

الف:......"حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انهم قد کذبوا جاء هم نصرنا فنجی من نشاء ولا یرد بأسنا عن القوم المجرمین۔" (یوسف:۱۱۰)

ترجمہ:......"یہاں تک کہ پیغمبر... اس بات سے... مایوس ہو گئے اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی، ان کو ہماری مدد پہنچی، پھر... اس عذاب سے... ہم نے جس کو چاہا وہ بچا لیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا۔"

ب:......"ام حسبتم ان تدخلوا الجنّة ولمّا یأتکم مثل الّذین خلوا من قبلکم مسّتهم البأساء والضّرّاء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا معه متیٰ نصر الله، الا ان نصر اللّٰه قریب۔" (البقرہ:۲۱۴)

ترجمہ:......"کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات ان لوگوں جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے، یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی اللہ کی مدد؟ سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔"

اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ کفار و مشرکین کے مقابلہ میں نیک و صالح مسلمانوں کے لئے فوراً نصرت الٰہی کا آنا کوئی ضروری نہیں، اس کے علاوہ مدد و نصرت الٰہی میں تاخیر کا ہو جانا جہاں کفار و مشرکین اور ان کے موقف کی صداقت کی دلیل نہیں، وہاں

نیک صالح اور متقین ومومنین کے بارگاہِ الٰہی میں مبغوض ومقہور ہونے کی علامت بھی نہیں، کیونکہ دورِ حاضر کے نیک وصالح مومنین و متقین، اپنی جگہ کتنا ہی مقرب بارگاہ الٰہی کیوں نہ ہوں، بہرحال وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے مرتبہ ومقام کو نہیں پہنچ سکتے، لہٰذا اگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی مدد ونصرت میں تاخیر ہوسکتی ہے تو دورِ حاضر کے نیک صالح مومنین ومجاہدین کی مدد میں تاخیر کیوں نہیں ہوسکتی؟

۱۱:......اس سب سے ہٹ کر سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجودہ صورت حال میں جہاں اہلِ ایمان کو مصائب وآلام سے دوچار کر کے ان کے درجات بلند کرنا چاہتے ہیں، وہاں ان بدباطن کفار ومشرکین اور نام نہاد مسلمانوں پر اتمام حجت کرنا چاہتے ہیں، تاکہ کل قیامت کے دن وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں غور وفکر کی مہلت اور صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔

الغرض موجودہ صورت حال سے جہاں نیک صالح لوگوں اور مقربین بارگاہِ الٰہی کے درجات بلند ہو رہے ہیں، وہاں ان بدباطنوں کو ڈھیل دی جارہی ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: ”واملی لھم ان کیدی متین “(القلم:۴۵)... اور میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں مگر میری تدبیر غالب ہے، اسی طرح: ”وانتظروا انا منتظرون “(ھود:۱۲۲)... تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کررہے ہیں... مرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ کون فائدہ میں تھا اور کون نقصان میں؟؟

فسوف تریٰ اذا انکشف الغبار
اتحت رجلک فرس ام حمار

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد والہ واصحابہ اجمعین

دورِ حاضر میں علماء وطلباء کے خلاف

خطرناک سازش

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

یہ زمانہ ڈپلومیسی اور چالبازی کا ہے۔ جس مخالف اور بزعمِ خود دشمن طبقہ اور اس کے مراکز کے خلاف جنگ کرنی ہوتی ہے' میدانِ حرب وضرب اور جبر واستبداد میں ''گرم جنگ'' لڑنے سے برسوں پہلے میدانِ صحافت میں ''سرد جنگ'' لڑی جاتی ہے' یعنی پہلے اس کے خلاف اخبارات ورسائل میں مضامین ومقالات شائع ہوتے ہیں' تاکہ زمین یعنی ''رائے عامہ'' کو اس کے خلاف ہموار کرلیا جائے' اس کے بعد حکومت کی ''کنٹرولنگ مشینری'' حرکت میں آتی ہے اور ابتداء صرف حکومت سے رکگنیشن یعنی الحاق کی دعوت دی جاتی ہے، ساتھ ساتھ ''ایڈ''.... مالی امداد.... کالقمۂ چرب وشیریں اربابِ مراکز ومدارس کے منتظمین کے سامنے ڈالا جاتا ہے' اگر یہ حربہ کامیاب نہیں ہوتا تو پھر قانون کے ذریعہ رکگنیشن ...الحاق... پر مجبور کیا جاتا ہے' اس کے بعد نصاب اور درسی کتابوں میں کتر بیونت کی جاتی ہے' قدیم علوم کی ٹھوس قابلیت پیدا کرنے والی کتابیں نکال کر ان کی جگہ عصری علوم وفنون کی کتابیں لائی جاتی ہیں' اس طرح دینی علوم کی جان تو نکال ہی لی جاتی ہے' اسی کے ساتھ ان ملحقہ مدارس کی سندوں کو وزارتِ تعلیمات سے منظور کرادیا جاتا ہے اور سرکاری' نیم سرکاری' تعلیمی اور غیر تعلیمی اداروں میں ملازمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں' یہ طلبہ کے لئے لقمۂ چرب وشیریں ڈالا جاتا ہے اور پورے ملک سے ماہرین علوم دینیہ کو کھینچ لینے اور آزاد عربی مدارس کو ویران کردینے کی غرض سے ان نیم سرکاری یا سرکاری درس گاہوں میں کام کرنے والے ماہرین ومحققین علومِ دینیہ کے لئے گرانقدر مشاہروں اور الاؤنسز کے اعلانات کئے جاتے ہیں' ان کی سالانہ ترقی اور آخری تنخواہ کے ''منہ میں پانی بھرلانے والے'' گریڈ مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہ آزمودہ کار علماء ومحققین کی زبان وقلم کو حکومت کے خلاف بولنے اور لکھنے سے باز رکھنے کے لئے ''طلائی زنجیریں'' تیار کی جاتی ہیں' ان تدبیروں کے بعد بھی جو دین کو دنیا پر ترجیح دینے پر ایمان رکھنے والے علماء حق اور آزاد مدارسِ دینیہ عربیہ کے اساتذہ اور مبلغین وواعظین وخطباء اس ''دام ہمرنگ زمین'' میں گرفتار ہوکر اپنی کلمہ حق کہنے کی آزادی قربان کرنا نہیں چاہتے' ان کے خلاف حکومت کا قانون حرکت میں آتا ہے' اول ان کی قدر کفاف روزی پر حملہ کیا جاتا ہے اور ڈپٹی کمشنر کی منظوری کے بغیر پبلک سے چندہ وصول کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے' پھر ان کے گوشۂ عافیت پر یورش ہوتی ہے اور محکمۂ اوقاف کے ذریعہ یادگار ''صفۂ مسجد نبوی'' علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام یعنی مدارس عربیہ اور مکاتب دینیہ کی عمارتوں پر قبضہ کرکے انہیں خانماں برباد کردیا جاتا ہے' خدا کے گھروں یعنی مسجدوں پر قبضہ کیا جاتا ہے اور محکمۂ اوقاف کے ذریعہ غیر سند یافتہ مؤذنین' ائمہ اور خطباء کے لئے مسجدوں کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں' اوقاف کی قائم کردہ منتظمہ کمیٹی کے سیکرٹری سے اعلان کرادیا جاتا ہے کہ سیکرٹری کی اجازت

کے بغیر کوئی بھی عالم دین مسجد میں وعظ نہیں کہہ سکتا' پبلک جلسوں میں علماء کو کلمۂ حق کہنے سے روکنے کے لئے دفعہ ۱۴۴ لگادی جاتی ہے' ان علماء و مبلغین وواعظین کو جن سے حکومت کے خلاف بولنے کا خطرہ ہوتا ہے، کسی خاص علاقہ میں ''ان کی بستی میں'' یا ''گھروں میں'' قانون تحفظ امن عامہ کے تحت نظر بند کردیا جاتا ہے یا زبان بندی کردی جاتی ہے،اور جن علماءِ حق کے ملک میں موجود ہونے کو ہی حکومت اپنے مفاد کے لئے مضر سمجھتی ہے،ان کو جلاوطن کردیا جاتا ہے' تا آنکہ علماءِ حق کے لئے قانون شکنی کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا اور وہ قانون شکنی پر آمادہ ہوجاتے ہیں' تب گرم جنگ شروع ہوتی ہے اور جیلوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں' اگر جیلوں کی وحشیانہ اور ننگِ انسانیت ایذاء رسانیاں بھی ان کو حق بات کہنے سے نہیں روک سکتیں تو حکومتیں ان کو سولی پر چڑھا دینے میں بھی دریغ نہیں کرتیں اور علماءِ حق امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کی سنت کو بے دریغ زندہ کرتے ہیں اور قیدوبند کی تمام سختیوں بلکہ موت فی سبیل اللہ کو بھی لبیک کہتے ہیں۔

یہ ہوتے ہیں علماءِ حق پیدا کرنے والی علوم دینیہ کی درس گاہوں اور علماءِ حق کے بابرکت وجود کو کسی روئے زمین سے مٹانے کے دہ سالہ اور پنجسالہ منصوبے اور ان کے مختلف مرحلے۔ سادہ لوح عوام ان سے قطعاً ناواقف ہیں' مگر علماءِ حق ان سے خوب اچھی طرح واقف ہیں اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی راہ میں ہر مزاحمت کا مقابلہ کرنے اور ہر ظلم وجور کو سہنے اور ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہیں ،مگر کسی مرحلہ پر بھی علوم دینیہ کی حفاظت کا فرض انجام دینے اور حکومت کے اثر سے آزاد دینی خدمت انجام دینے کی سعادت سے کسی قیمت پر بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔**وما توفیقنا الا باللہ ھو مولانا نعم المولیٰ ونعم النصیر۔**

یہی وہ ہتھکنڈے ہیں جس کے ذریعہ موجودہ عہد میں تمام اسلامی ملکوں کی حکومتوں نے آزاد علوم عربیہ دینیہ کی درس گاہوں اور مکتبوں کو علوم آخرت اور علوم انبیاء سے یکسر خالی کیا ہے۔ انہی اسلامی ملکوں کا نام مدارس عربیہ کے خلاف حالیہ سرد جنگ میں بار بار لیا جارہا ہے' آج یہ تمام اسلامی ممالک علوم کتاب وسنت یعنی علم تفسیر واصول تفسیر' علم حدیث واصول حدیث' علم فقہ واصول فقہ اور ان کے معاون علوم کی ٹھوس اور باضابطہ تعلیم اور درس وتدریس سے یکسر محروم اور خالی ہوچکے ہیں' اس وقت برصغیر پاکستان وہندوستان کے سوا اور کسی ملک میں حکومتوں کے اثر سے آزاد علوم دینیہ کی درس گاہوں اور دینی مکتبوں کا وجود باقی نہیں رہا ہے اور صرف انہی دونوں ملکوں میں مذکورہ بالا علوم کتاب وسنت کی باضابطہ درس وتدریس اور تحفیظ وتجوید کلام اللہ کے سلسلے جاری ہیں اور اس آخیر زمانہ کے حسبِ حال علماء وحفاظ ومجودین قرآن' واعظین ومبلغین انہی دوملکوں میں ان درسگاہوں سے فارغ ہوکر نکل رہے ہیں اور مختلف دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان کی مساعی کی بدولت دینی روح جس درجہ میں بھی ہے، زندہ ہے۔ اور ان دونوں ملکوں کے مسلمانوں کا مزاج بہرحال دینی ہے' جو لوگ عہد حاضر کے ممالک اسلامیہ کی درسگاہوں کو قریب سے دیکھ چکے ہیں یا ان کی اصلیت سے باخبر ہیں، وہ ہمارے اس بیان کی تصدیق وتائید کریں گے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ علوم شرعیہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شیخ التفسیر' شیخ الحدیث اور شیخ الفقہ جیسے خالص دینی منصبوں پر تقرر کی پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ امیدوار عالم دین حقیقی معنی میں ہو یا نہ ہو، مگر امریکن یا یورپین ممالک کی کسی یونیورسٹی سے اس نے پی ایچ ڈی ضرور کیا ہو یعنی ''یورپ رٹرن'' اور مغرب زدہ ضرور ہو۔ یہودیوں اور نصرانیوں کا تریاق نما زہر جو اسلامی روح کے لئے سم قاتل ہے' اس نے چار سال تک ضرور پیا ہو۔

اس لئے اب علوم دینیہ عربیہ اور علماء دین پیدا کرنے والی عربی درس گاہوں کی حفاظت ان ملکوں کے علماء حق پر فرض کفایہ نہیں رہی' بلکہ فرض عین ہوگئی ہے۔

اگر فی الحقیقت حکومت کی نیت نیک ہے اور وہ واقعی ان مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو عصری علوم' عالمی حالات حاضرہ اور انگریزی زبان سے واقف بنا کر ان کو دینی خدمات انجام دینے کے لئے زیادہ کارآمد اور ان کی اسلامی دینی خدمات کو زیادہ مؤثر اور دوررس بنانا چاہتی ہے تو جیسا کہ اس کو اب سے تین سال پہلے وفاق المدارس العربیہ کی جانب سے مشورہ دیا جا چکا ہے۔ان مدارس عربیہ اور مکاتب دینیہ کو اور ان کے درسی نصابوں کو علی حالہ قائم رہنے دے اور کام کرنے دے۔ہاں ان کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے علماء حق کے مشورہ سے صرف علوم عصریہ اور انگریزی زبان کا ایک چہار سالہ نصاب الگ تجویز کرے اور اس کے لئے دو تین مستقل درس گاہیں مرکزی شہروں مثلاً: کراچی' لاہور' راولپنڈی اور پشاور میں قائم کرے یا موجودہ بڑے بڑے مدرسوں میں ہی یہ ''چہار سالہ نصاب'' اپنے خرچ پر یا اگر ان مدارس کے فنڈ میں گنجائش ہو تو انہیں کے خرچ پر قائم کرے اور صرف دینی خدمات کے مناصب کے لئے اس کی سند کو تسلیم کرے' دفتری ملازمتوں کے لئے نہیں۔تو ان علماء کی دینی خدمات زیادہ مؤثر اور دوررس ہو سکیں گی اور قدیم علوم' حالاتِ حاضرہ اور انگریزی زبان سے ناواقفیت کے نقص کو دور کر سکیں گے اور حقیقی معنی میں ''علوم عصریہ'' سے واقف علماء دین بن سکیں گے اور اندرون ملک و بیرون ملک دینی خدمات انجام دے سکیں گے۔

محکمۂ اوقاف کا ترتیب کردہ قدیم علوم دینیہ اور جدید علوم عصریہ کا ''مخلوط'' نصاب۔آدھا تیتر آدھا بٹیر' جو اس وقت محکمۂ اوقاف کی درس گاہ جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں رائج ہے' علوم دینیہ عربیہ کے لئے تو تباہ کن ہے ہی' علوم عصریہ اور حالات حاضرہ کی کما حقہ واقفیت اور انگریزی زبان کی قابلیت پیدا کرنے میں بھی ناکام ہے۔جن ناطرفدار لوگوں نے جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے نصاب اور اس کی تعلیم و تدریس کی تفصیلات کہ بخاری سال میں جتنی ہوتی ہے اور ہدایہ کتنا ہوتا ہے اور جلالین کتنی ہوتی ہے کو قریب سے دیکھا ہے، وہ اس کے شاہد ہیں۔

علم اقسام اور اس کے فوائد

علم' دین کا ہو یا دنیا کے کسی شعبے کا' وہ بہرحال انسانیت کے لئے تمغۂ فضیلت اور طرۂ امتیاز ہے اور تعلیم کا مقصد فضل وکمال سے آراستہ ہونا اور میراثِ انسانیت کا حاصل کرنا ہے' موضوع کے لحاظ سے علم کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں:۱- دینی علوم۔۲- دنیاوی علوم۔

دینی علوم کے اصل ثمرات و برکات تو آخرت ہی میں ظاہر ہوں گی' تاہم جب تک دنیا میں اسلام کی عزت و رفعت کا دور دورہ رہا، دنیا میں بھی اس کی منفعتیں ظاہر ہوتی تھیں۔علمائے دین' قاضی' قاضی القضاۃ' مفتی اور شیخ الاسلام کی حیثیت سے محاکم عدلیہ اور محاکم احتساب کے مناصب پر فائز ہوتے تھے' ملک و ملت کے لئے ان کا وجود سایۂ رحمت سے کم نہیں تھا' ان کی خدا ترسی' حق پسندی اور عدل پروری کی بدولت معاشرہ میں امن و عافیت کی فضا قائم تھی اور اسلام کے عادلانہ احکام کا نفاذ بہت سے معاشرتی امراض سے حفاظت کا ضامن تھا۔

الغرض دینی مناصب کے لئے علمائے دین ہی کا انتخاب و تقرر ہوتا تھا، اور آج بھی جن ممالک میں اسلامی نظام کسی حد

تک رائج ہے‘اس کے کچھ نمونے موجود ہیں، اور دنیوی علوم جن کا تعلق براہ راست دنیا کے نظام سے تھا‘ مثلاً فلسفہ‘ منطق‘ تاریخ‘ جغرافیہ ریاضی‘ ہیئت‘ حساب‘ طب وجراحت وغیرہ ان کے لئے تو حکومتی مناصب بیشمار تھے‘اور علوم کی یہ تقسیم کہ کچھ علوم دینی ہیں اور کچھ دنیاوی‘ محض موضوع کے لحاظ سے ہے مگر اس کے معنی دین ودنیا کی تفریق کے ہرگز نہیں‘ چنانچہ دنیوی علوم اگر بے ہودہ اور لایعنی نہ ہوں اور انہیں خدمتِ خلق‘ اصلاحِ معاش اور تدبیر سلطنت کی نیت سے حاصل کیا جائے تو وہ بھی بالواسطہ رضائے الٰہی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور دین ودنیا کی تفریق ختم ہوجاتی ہے اور اس کے برعکس جب دینی علوم کی تحصیل کا مقصد محض دنیا کمانا ہوتو یہ علوم بھی بالواسطہ دنیا کے علوم کی صف میں آجاتے ہیں اور اس کے لئے احادیثِ نبویہ میں سخت سے سخت وعیدیں بھی آئی ہیں‘ مثلاً ایک حدیث میں ہے:

”من تعلم علماً مما یبتغی به وجه الله لایتعلمه الا لیصیب به عرضاً من الدنیا لم یجد عرف الجنة یوم القیامة‘ یعنی ریحها“۔ (مشکوٰۃ:۳۴‘۳۵)

ترجمہ:....”جس شخص نے وہ علم سیکھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوسکتی ہے اور پھر اس کو متاعِ دنیا کا ذریعہ بنایا تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا“۔

ایک اور حدیث میں ہے:

”من طلب العلم لیجاری به العلماء او لیماری به السفهاء او یصرف وجوه الناس الیه ادخله الله النّار“۔ (مشکوٰۃ:۳۴)

ترجمہ:...”جس شخص نے اس غرض سے علم حاصل کیا کہ اس کے ذریعہ علماء سے مقابلہ کرے یا کم عقلوں سے بحث کرے یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرے‘ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو آگ میں ڈالیں گے“۔

بہرحال ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ دینی علوم بھی دنیا کے علوم بن جاتے ہیں اور دنیوی علوم بھی رضائے الٰہی اور طلب آخرت کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور دین ودنیا کی تفریق ختم ہوجاتی ہے‘ گویا اصل مدار مقاصد ونیات پر ہے کہ اگر مقصد رضائے الٰہی ہے تو دنیوی علم بھی دین کے معاون ومددگار‘ اور صنعت وحرفت کے تمام شعبے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے وسائل بن جاتے ہیں۔

علوم خواہ قدیم ہوں یا جدید اور دینی ہوں یا دنیوی ان سب سے مقصد رضائے الٰہی کے مطابق ایک صالح معاشرہ کا قیام ہونا چاہئے اور یہ مقصد اسی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص جس شعبۂ زندگی سے منسلک ہو‘ وہ اس شعبہ سے متعلق بقدرِ ضرورت دینی مسائل سے بھی واقف ہو‘ مسلمان تاجر ہو تو تجارت سے متعلقہ دینی مسائل کا عالم ہو‘ انجینئر ہو تو عالم ہو‘ طبیب اور ڈاکٹر ہو تو عالم ہو‘ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد میں جو خلافت راشدہ کا تابناک دور ہے‘ ایک قانون یہ تھا: ”لایبع فی سوقنا هذا من لم یتفقه فی الدین“ ۔...”جو شخص فقیہ...دینی مسائل کا ماہر.....نہ ہو‘ اس کو ہمارے بازار میں خرید وفروخت کی اجازت نہیں“۔ گویا دنیا کمانے کے لئے بھی علم دین کی ضرورت ہے‘ تاکہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تمیز ہوسکے اور خالص سود‘ سودی کاروبار اور غیر شرعی معاملات میں مبتلا نہ ہو۔

الغرض ایک دور ایسا تھا کہ ہر ہنر وکمال کا مقصد آخرت اور رضائے الٰہی تھا اور اب ایک دور ایسا آگیا ہے کہ ہر چیز کا مقصد دنیا ہی دنیا بن کر رہ گیا‘ بلکہ اب تو اس میں بھی اس قدر تنزل رونما ہوا ہے کہ دنیا کی بھی تمام حیثیتیں ختم ہوکر رہ گئیں‘ اب تو واحد

مقصد صرف ''پیٹ'' رہ گیا ہے' دنیا کے ہر علم و ہنر اور فضل و کمال کا منتہائے مقصود بس یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ جہنم بھر جائے۔

جدید تعلیم اور اس کا مقصد

قدیم اصطلاح میں تو دینی علم ہی علم کہلانے کا مستحق تھا' دنیاوی علوم کو فنون یا ہنر سے تعبیر کیا جاتا تھا' مگر آج کی اصطلاح یہ ہوگئی ہے کہ قدیم علوم کے ماہر کو عالم کہا جاتا ہے اور جدید علوم کے ماہرین کو ''تعلیم یافتہ'' کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ امریکہ اور یورپ وغیرہ کے جو ممالک جدید علوم کے امام ہیں' وہاں آج بھی کسی ''تعلیم یافتہ'' کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی اسکول میں ٹیچر' کسی کالج میں پروفیسر یا سرکاری دفتر میں ملازم ہو' بلکہ وہاں تعلیم کا مقصد ہنر و کمال کی تحصیل سمجھا جاتا ہے' تاکہ ہر شعبۂ حیات میں ہنر و کمال کے مالک افراد موجود ہوں' ان ممالک میں ٹیکسی ڈرائیور اور بسوں کے کنڈیکٹر بھی گریجویٹ ہوتے ہیں' یہ کہیں بھی نہیں سمجھا جاتا کہ بی اے یا ایم اے ہونے کے بعد دکان پر بیٹھنا یا کارخانے میں جانا یا ڈرائیور بننا باعثِ توہین ہے' پھر نہ معلوم ہمارے ملک میں یہ کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص تعلیم یافتہ یا گریجویٹ ہو' اس کے لئے سرکاری ملازمت لازم ہے' ورنہ اس کی حق تلفی اور اس کی ڈگری کی توہین متصور ہوگی۔

برطانوی دور میں اس جدید تعلیم کا مقصد بلاشبہ یہی سمجھا یا گیا تھا کہ اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تیار ہونے والے افراد سرکاری مشینری کے کل پرزے بنیں گے' کیونکہ اس اجنبی ملک میں حکومت کی انتظامی ضرورت پوری کرنے کے لئے ان کو ایک ایسی نسل کی ضرورت تھی جس سے ان کی حکومت کا کاروبار چل سکے' وہ انگلستان سے اتنے انگریز یہاں نہیں لا سکتے تھے کہ اتنے بڑے بر کوچک کا تمام کام سنبھال سکیں' انہیں دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی حکمرانی کرنی تھی' کلیدی مناصب تو ضرور وہ اپنوں ہی کو دیا کرتے تھے یا پھر ان کو جو سو فیصد ان کے حاشیہ بردار بن جائیں' مگر نیچے درجہ کے لئے انہیں یہیں سے آدمی مہیا کرنے تھے۔

علاوہ ازیں اس جدید تعلیم سے انگریز کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی لوگ انگریزی تہذیب و تمدن کے اتنے دلدادہ ہو جائیں کہ ظاہر و باطن میں انگریز ہی انگریز نظر آئیں اور لارڈ میکالے کی پیش گوئی پوری ہو جائے۔

الغرض یہ ذہنیت انگریزی دور کی پیداوار ہے کہ تعلیم حاصل کرنا صرف ملازمت کے لئے ہے' ظاہر ہے کہ تعلیم کی رفتار میں ہر سال تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور سرکاری مناصب اور ملازمتیں محدود ہیں' تعلیمی تناسب سے ان میں اضافے کا امکان نہیں' نہ یہ ممکن ہے کہ تمام تعلیم یافتہ افراد کو سرکاری ملازمتوں میں کھپایا جا سکے اور یہ تو طلبہ کا مسئلہ تھا' اس پر مستزاد یہ کہ طالبات بھی اب تعلیم کے میدان میں اسی تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہیں اور وہ بھی ملازمت کی خواہاں ہیں' جب نئی نسل کو مستقبل تاریک نظر آتا ہے تو ان میں بے چینی پھیلتی ہے اور اس کا نتیجہ اس عبرت ناک منظر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو گذشتہ دنوں کراچی یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیکھنے میں آیا کہ گورنر تک کے لئے آبرو بچانا مشکل ہو گیا' یہ ہیں جدید تعلیم کی برکات! اور یہ ہیں جدید تعلیم یافتہ حضرات ''**ان فی ذلک لعبرة لاولی الابصار**'' یہ صورت حال تمام اہل دانش اور اربابِ اقتدار کے لئے لمحۂ فکریہ ہے' اگر جدید نسل کے اس ذہنی کرب کا صحیح حل تلاش نہ کیا گیا تو اس کے نتائج اس سے زیادہ ہولناک ہوں گے۔

یہودی مدارس میں عسکریت کی تعلیم!

اور انتہا پسند یہودیوں کا مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب

مولانا سعید احمد جلال پوری

اسلام، مسلمانوں، دین، دینی مدارس، علماء، طلبہ اور دینی تعلیم کو مطعون و بدنام کرنے، ان کے خلاف پروپیگنڈا مہم چلانے، گزگز کی زبان نکال کر ان کو بے نقط سنانے والوں اور دینی مدارس کو بند، ان میں رائج تعلیم و نصابِ تعلیم کو ختم یا تبدیل کرنے کی سفارش کرنے والے یہود و نصاریٰ، ان کے ایجنٹوں اور نام نہاد مسلمان حکمرانوں کو ذرا اس طرف بھی توجہ کرنی چاہئے کہ بی بی سی کے مطابق اسرائیل میں یہودیوں کے باقاعدہ مذہبی مدارس قائم ہیں، جہاں خالص یہودی مذہبی نصاب اور نظامِ تعلیم رائج ہے، وہاں خالص یہودی مذہبی افراد تیار کئے جاتے ہیں اور انہیں اسرائیل جیسی صہیونی اور خالص یہودی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ان یہودی مذہبی مدارس میں باقاعدہ عسکریت اور سپاہ گری کی تعلیم و تربیت کا مکمل انتظام ہے اور وہاں مکمل فوجی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے دینی مدارس، ان کی خالص دینی، مذہبی، اسلامی تعلیم، نصابِ تعلیم اور پروگرام ناقابل برداشت اور ناقابل قبول ہے، تو یہودی مذہبی مدارس، ان کا یہودی مذہبی نصاب اور نظامِ تعلیم کیونکر قابل برداشت ہے؟ اگر اسرائیل اور ان کے سرپرست یہودی مدارس، ان کے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کو ختم اور تبدیل کرنے پر زور نہیں دیتے یا ان عسکریت پسند مدارس اور ان کے کٹر بنیاد پرست مذہبی راہ نماؤں، طلبہ اور اساتذہ کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے، تو انہیں مسلمانوں کے خالص دینی، مذہبی اور اصلاحی مدارس، ان کے نصابِ تعلیم، ان کے اساتذہ، طلبہ اور مذہبی راہ نماؤں سے کیوں پرخاش ہے؟ اور وہ ان کے خلاف کیونکر برسرپیکار ہیں؟

اگر یہودی ان مذہبی مدارس، عسکریت پسند مذہبی راہ نماؤں اور ان کے طلبہ کو اپنا مخالف نہیں سمجھتے تو نام نہاد مسلمان ممالک کے اربابِ اقتدار ان خالص اسلام پسند دینی، مذہبی، اصلاحی اداروں، مدارس، ان کے اساتذہ اور طلبہ کو اپنا مخالف کیوں سمجھتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ یہودی اور اسرائیلی حکومت اپنے جھوٹے دین و مذہب کے ساتھ مخلص ہیں، مگر نام نہاد مسلمان اپنے سچے دین و مذہب سے غیر مخلص یا باغی ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو بتلایا جائے کہ اس مخالفت و عداوت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ یورپ، امریکا اور اسلام دشمن سپر طاقتوں کے دباؤ اور ایجنڈے کی تکمیل میں یہ سب کچھ ہو رہا ہو؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہے تو کیا یہ نام نہاد مسلمان حکمران اور بے غیرت حکام ان کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر مسلمانوں کے دینی مدارس اور ان کا نصاب و نظامِ تعلیم ناقابل برداشت ہے تو یہودیوں کے دینی، مذہبی، مدارس، ان کا نصاب و نظامِ تعلیم اور عسکری تعلیم و تربیت

گا ہیں کیونکر قابل برداشت ہیں؟ اگر مسلمان مدارس کے خلاف کریک ڈاؤن کیا جاسکتا ہے، ان پر بم برسائے جاسکتے ہیں ان کے طلبہ کو دہشت گرد، تشدد پسند کہا جاسکتا ہے، تو یہودی مدارس اوران کے طلبہ کے خلاف یہ ''پُر وقار'' القاب کیوں نہیں استعمال کئے جاسکتے ؟

الغرض اگر مسلمانوں کے دینی مدارس، جہاں فوجی تربیت، سپاہ گری اور عسکریت وغیرہ کسی قسم کی کوئی تعلیم نہیں دی جاتی، اگر یہ ہضم نہیں ہوسکتے تو جن یہودی مذہبی مدارس میں باقاعدہ عسکریت کی تعلیم وتربیت ہوتی ہے، وہ کیونکر قابل برداشت ہیں؟ اگر مسلم دینی مدارس اور طلبہ کے خلاف بولا اور لکھا جاسکتا ہے؟ ان کو بدنام کیا جاسکتا ہے؟ یا ان کے خلاف پوری دنیا میں دہشت گردی کا پروپیگنڈا کیا جاسکتا ہے تو یہودی مذہبی اور عسکریت پسند مدارس کے خلاف کیوں نہیں لکھا اور بولا جاسکتا؟ لیجئے بی بی سی اردو ڈاٹ کام کی اس سلسلہ کی خبر پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ نام نہاد مسلمان حکام اور متعصب وکٹر یہودیوں کے طرزِ عمل میں کس قدر زمین و آسمان کا فرق ہے؟ تفصیل اس جمال کی یہ ہے کہ گزشتہ دنوں مغربی یروشلم کے اسرائیلی مذہبی اسکول پر ایک شخص نے فائرنگ کرکے آٹھ یہودی مذہبی طلبہ کو قتل کردیا تو اس پر پوری یہودی دنیا چیخ اٹھی، بی بی سی اردو ڈاٹ کام کی خبر ملاحظہ ہو:

''مغربی یروشلم میں ہزاروں کی تعداد میں اسرائیلی اس اسکول کے باہر جمع ہوگئے ہیں، جہاں ایک مسلح شخص کے حملے میں آٹھ افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ یہودیوں کے مذہبی اسکول میرکز ہیراف کے باہر جمع غمزدہ لوگ اس وقت آبدیدہ ہوگئے، جب ایک یہودی رابی نے ہلاک ہونے والوں کی میتوں پر دعائیہ کلمات کہنا شروع کئے۔ بی بی سی کے نامہ نگار کرسپن ٹورولڈ کا کہنا ہے کہ لوگوں کی طرف سے غم کے اظہار سے اسرائیلی حکومت پر سخت ردِعمل ظاہر کرنے کا دباؤ بڑھ گیا ہے، تاہم اسرائیل نے کہا ہے کہ وہ امن مذاکرات کو ختم نہیں کرے گا۔

اس حملے میں ملوث فلسطینی مسلح شخص اسکول کے قریب ڈرائیور کے طور پر ملازم تھا۔ پولیس نے اس شخص کی شناخت کرلی ہے اور بتایا کہ اس کا نام علاؤ الدین ابو دہیم تھا اور مشرقی یروشلم کا رہائشی تھا۔ مشرقی یروشلم میں یہ واقعہ غزہ پر اسرائیلی فوجی کارروائی کے بعد پیش آیا ہے، جس میں ایک سو بیس سے زیادہ فلسطینی ہلاک ہوگئے تھے۔

ہمارے نامہ نگار کے مطابق اسرائیلی سیکورٹی فورسز اس بات کا بغور جائزہ لے رہی ہیں کہ علاؤ الدین ابو دہیم کا تعلق کسی مسلح گروپ سے نہیں تھا۔ لبنان میں حزب اللہ تنظیم کے قریبی ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق فلسطینیوں کے ایک غیر معروف گروپ جلیل فریڈیم بٹالین یا الشہداء عماد مغنیہ وشہداء غزا نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کرلی ہے۔

عماد مغنیہ حزب اللہ تنظیم کے ایک اعلیٰ اہلکار تھے اور وہ دمشق میں بارہ فروری کو ایک بم دھماکے میں ہلاک ہوگئے تھے۔

مذہبی اسکول میں ہلاک ہونے والے تمام اسرائیلی تیس سال سے کم عمر تھے۔ عینی شاہدوں کے مطابق ابو دہیم اس مدرسے کی لائبریری سے اندر داخل ہوئے، جہاں اَسی (۸۰) طالب علم موجود تھے، ابو دہیم نے اندر داخل ہوتے ہی کلاشنکوف سے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ طالب علموں میں بھگدڑ مچ گئی اور انہوں نے

کھڑکیوں سے باہر چھلانگیں لگانا شروع کردیں۔ اس سے قبل کہ ایک سابق فوجی ابودہیم کو ہلاک کرتا ایک طالب علم نے ابودہیم کو دو گولیاں ماریں۔

بی بی سی کے مشرق وسطیٰ کے امور کے ماہر اور مدیر جرمی بوؤن کا کہنا ہے کہ یہ کوئی عام مدرسہ نہیں تھا بلکہ یہ غرب اردن میں یہودیوں کی آبادکاری کے نظریہ کا منبع ہے۔ اس میں زیر تعلیم زیادہ تر طالب علم مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عسکری تربیت بھی حاصل کررہے تھے۔

جرمی بوؤن کے مطابق اس اسکول کے باہر جمع ہونے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو پہلے ہی ایہود اولمرت کی طرف سے فلسطینیوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کے مخالف ہیں۔''

(بی بی سی اُردو ڈاٹ کام، ۷/ مارچ ۲۰۰۸ء)

ان آٹھ یہودی مذہبی طلبہ کی ہلاکت پر ایسا لگتا ہے جیسے دنیا میں کوئی بھونچال آ گیا ہو! ورنہ دنیا میں روزانہ سینکڑوں نہیں ہزاروں معصوم و بے گناہ قتل ہورہے ہیں اور ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جارہا ہے۔ ان میں سے دینی، مذہبی، سیاسی اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ جوان، بوڑھے، مردوں، عورتوں کے ساتھ ساتھ معصوم اور شیرخوار بچے بھی ہوتے ہیں مگر ان بے قصوروں کے قتل عام پر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی، صرف یہی نہیں بلکہ آئے دن بم دھماکے، نام نہاد خودکش حملے، ۵۲ بی کی بمبارمنٹ، راکٹ لانچر اور فاسفورس بم تک گرائے جاتے ہیں، اور آنِ واحد میں ہنستے بستے گھر، بستیاں اور شہروں کے شہر کھنڈرات میں تبدیل کردیئے جاتے ہیں، مگر اس پر نہ کوئی ہنگامی صورت حال ہوتی ہے نہ ایمرجنسی لگتی ہے، نہ سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلایا جاتا ہے اور نہ ہی اقوام متحدہ کو اس کی مذمت کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بلکہ وہ ایک معمول کی کارروائی کہلاتی ہے، لیکن دوسری طرف اگر ایک یہودی اسکول کے آٹھ عسکریت پسند طالب علم ہلاک ہوتے ہیں تو سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کرلیا جاتا ہے، اور اقوام متحدہ اس پر مذمت کرتی ہے اور ہنگامی اجلاس بلالیتی ہے، لیجئے اس سلسلہ کی خبر؟ ملاحظہ ہو:

''مقبوضہ بیت المقدس...... مقبوضہ بیت المقدس میں یہودیوں کے مذہبی اسکول پر فائرنگ کے نتیجے میں ایک حملہ آور سمیت ۹ افراد ہلاک ہوگئے ہیں، دوسری جانب اس واقعے پر شدید عالمی ردِعمل دیکھنے میں آیا ہے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے فائرنگ کے واقعے پر اظہار مذمت کرتے ہوئے ہنگامی اجلاس طلب کرلیا ہے۔
واضح رہے کہ مقبوضہ بیت المقدس میں یہودیوں کے مذہبی اسکول میں فائرنگ کرکے آٹھ افراد کو ہلاک اور پینتیس کو زخمی کردیا گیا تھا، فائرنگ کے واقعے کے بعد اسرائیل میں سیکورٹی ہائی الرٹ کردی گئی ہے، اسرائیل نے الزام لگایا ہے کہ حملہ آوروں کا تعلق مشرقی بیت المقدس سے ہے۔'' (روزنامہ جنگ کراچی ۷: مارچ: ۲۰۰۸)

یہودی مذہبی اسکول پر حملہ آور مسلمان ڈرائیور ابودہیم، اس عسکری تربیت گاہ اور یہودی مذہبی اسکول کے اسلحہ بردار طالب علم کی فائرنگ سے جاں بحق ہوگیا، مگر اس کے باوجود تاحال یہودی بغض وعناد کی آگ کے شرارے فرو نہیں ہوئے انہوں نے اس کا انتقام لینے کے لئے کیا منصوبہ بنایا؟ اور یہودی مذہبی راہ نماؤں کے اس پر کیا جذبات ہیں؟ ملاحظہ ہوں:

''مقبوضہ بیت المقدس (اے پی پی) دنیا بھر میں مسلم دینی مدارس کو دہشت گردی کی آماجگاہ قرار دینے کا

پروپیگنڈا کرنے والے صہیونی ملک اسرائیل کے چینل ون ٹی وی نے انکشاف کیا ہے کہ یہودیت کی تعلیم حاصل کرنے والے ۳ نوجوانوں نے اپنی درس گاہ پر حملے کا مسلمانوں سے بدلہ لینے کا منصوبہ بنالیا ہے۔ ٹی وی چینل کے مطابق تینوں یہودی نوجوان مسجد اقصیٰ سے وابستہ کسی نامور مسلمان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہودی مذہبی درسگاہ پر حملے کے بعد ۳ یہودی طلباء نے اپنے منصوبے کے حوالے دوربیوں (یہودی مذہبی عالم) سے ملاقات کی ایک ربی نے حملے کا منصوبہ بنانے والے یہودی طلباء کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا، جبکہ تل ابیب کے نواحی علاقے میں رہائش پذیر ایک ربی نے منصوبے کی منظوری دے دی ہے۔ اس منصوبے کا ہدف مسجد اقصیٰ سے منسلک ایک مسلم عالم دین کو جسمانی ضرر پہنچانا ہے۔ اس ضمن میں اب تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی، جبکہ پولیس حکام کا کہنا ہے کہ وہ یہودی درسگاہ پر حملے کے ردِ عمل میں کسی بھی واقعے کے لئے تیار ہے۔''

(روزنامہ امت کراچی، ۱۲/ مارچ ۲۰۰۸ء)

مسلمانوں کے خلاف انتہا پسندی و دہشت گردی کا ڈھنڈورا پیٹنے اور بھونڈا راگ الاپنے والے شورہ پشت یہودیوں نے اپنے چند طلبہ کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لئے کس انتہا پسندی، دہشت گردی کا منصوبہ بنایا ہے؟ اور اس سلسلہ میں وہ کہاں تک آگے جانے والے ہیں؟ ان کے مذہبی پیشوا مسلمانوں، ان کی مقدس عبادت گاہوں اور مذہبی راہ نماؤں کو کیا مزہ چکھانا چاہتے ہیں؟ ملاحظہ ہو:

''بیت المقدس (ثناء نیوز) اسرائیل کے انتہا پسند مذہبی رہنماؤں نے حال ہی میں مذہبی اسکول پر حملہ آور کا بدلہ لینے کے لئے مسجد اقصیٰ پر حملہ کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔ مڈل ایسٹ اسٹیڈی سینٹر کی رپورٹ کے مطابق تین اعلیٰ سطحی مذہبی پیشواؤں نے مشترکہ طور پر جاری ایک فتوے میں کہا ہے کہ یہودی شریعت کی رو سے یہودی شہریوں کے قتل کے بدلے مخالف مذہب کے مقدس مقامات کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ شریعت کی رو سے مسجد اقصیٰ کو یہودی شہریوں کے بدلے مسمار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ فلسطینی مسلمان بھی یہودی آبادکاروں کو نشانہ بنارہے ہیں۔ مشورے میں مزید کہا گیا ہے کہ ان کی شریعت نہ صرف مذہبی مقامات پر حملوں کی اجازت دیتی ہے بلکہ ایک عام یہودی کے بدلے دوسرے مذہب کے اعلیٰ سطحی راہنماؤں کو بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔''

(روزنامہ جنگ کراچی، ۱۴/ مارچ ۲۰۰۸ء)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہودی اپنے دین و مذہب، مذہبی درس گاہوں، اپنے مذہبی طلبہ اور اپنے مذہبی لوگوں کے بارہ میں کس قدر حساس ہیں؟ جو یہودی آئے دن مسلمانوں کی مقدس شخصیات، ان کے معصوم شہریوں، جوانوں، بوڑھوں، بچوں اور خواتین کو تہہ تیغ کرتے ہیں اور مسلمان آبادیوں پر بمباری کرکے ان کے شہروں کو کھنڈرات بنارہے ہیں، اگر ان کے چند طلبہ، کسی ردِ عمل میں مارے جاتے ہیں اور ان کا قاتل ان کی تیغ جفا سے بچ کر بھی نہیں جاسکا، مگر بایں ہمہ وہ اس قدر بپھر چکے ہیں کہ انہوں نے یک آواز ہوکر فتویٰ صادر کردیا کہ ان آٹھ عسکریت پسند مذہبی طلبہ کے بدلہ اور انتقام میں مسلمان مذہبی راہ نماؤں، ان کی مقدس عبادت گاہوں حتیٰ کہ مسجد اقصیٰ کو بھی نشانہ بنانا جائز ہے۔

اس موقع پر ہم دنیا بھر کے انصاف پسند افراد، جماعتوں، مسلمانوں، دینی مذہبی راہ نماؤں، اخبارات ومیڈیا کے ذمہ داروں اورارباب ِقلم سے عرض کرنا چاہیں گے کہ اگر مسلمانوں، مسلمان مدارس، دینی، مذہبی اداروں کے خلاف یہودیوں، ان کے ایجنٹوں، ان کے وفاداروں اوران کے نمک خواروں اوران کے زرخرید غلاموں کی زبان وقلم حرکت میں آ سکتے ہیں تو حق وانصاف کے علمبرداروں کی زبان وقلم ان یہودی مدارس کے خلاف حرکت میں کیوں نہیں آ سکتے؟ صرف اس لئے کہ یہودی مدارس کو یورپ وامریکا اور سپر طاقتوں کی سرپرستی حاصل ہے؟ اور مسلمان دینی مدارس اس سے محروم ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو آپ بھی اس حقیقت کو اجاگر کریں اوراپنی تمام تر صلاحیتوں کو حق کا ساتھ دینے کے لئے بروئے کار لائیں، یہ آپ کا دینی، مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور قانونی فرض بنتا ہے، اگر آپ نے اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کی تو نہ صرف یہ کہ آپ اپنا وزن ان ظالموں کے پلڑے میں ڈالنے والے ہوں گے بلکہ تاریخ میں آپ کا نام بھی ان ظالموں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔

سید احمد شہیدؒ اور تحریکِ جہاد

(۳)

قاری محمد اقبال، رحیمی

پٹنہ میں طویل قیام کے بعد ان کے مریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک با قاعدہ نظامِ حکومت کی ضرورت پیش آ گئی' کلکتہ میں ان کے ارد گرد اس قدر ہجوم ہو گیا تھا کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا ان کے لئے مشکل تھا۔ بالآخر انہیں پگڑی کھول کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر وہ شخص جو اس کے کسی حصے کو چھو لے گا ان کا مرید ہو جائے گا۔

۱۸۲۲ء میں وہ حج کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ چلے گئے، اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمبئی میں وارد ہوئے، یہاں پر آپ کی تبلیغی کوششوں کو وہی کامیابی حاصل ہوئی جو کلکتہ میں ہوئی تھی، مگر اس ولی کے لئے انگریزی علاقے کے پرامن شہریوں کی بجائے ایک اور زیادہ موزوں میدان موجود تھا۔ ۱۸۲۴ء میں سرحد پشاور کے وحشی اور پہاڑی قبیلوں میں آ نمودار ہوئے، یہاں انہوں نے سکھ سلطنت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی تبلیغ شروع کر دی۔ پٹھانوں کے قبائل نے نہایت جوش وخروش کی ساتھ ان کی دعوت پر لبیک کہی، انہوں نے کابل اور قندھار کا سفر اختیار کیا اور جہاں کہیں بھی گئے، ملک کو جہاد پر آمادہ کرتے رہے' اس طرح پر مذہبی احکام کی کامیابی کے لئے راستہ صاف کرنے کے بعد انہوں نے خدا کے نام پر ایک با قاعدہ فرمان جاری کیا، جس میں تمام مسلمانوں کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی' کہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء کو سکھوں کے خلاف جہاد شروع ہو جائے گا۔ اس اثناء میں امام صاحبؒ کے قاصدوں نے اس اعلان کو شمالی ہندوستان کے ان بڑے شہروں میں پہنچا دیا، جہاں انہوں نے اپنے مرید بنائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سکھوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ شروع ہو گئی، اس جنگ میں کبھی ایک فریق غالب آیا اور کبھی دوسرے فریق کو فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح انہوں نے جنگ چپاول میں فتح مندی سے اپنا نام یہاں تک پیدا کر لیا کہ سکھ حاکم ان قبائل کی حمایت خریدنے پر مجبور ہو گیا جو چھاپہ مارنے میں سب سے پیش پیش تھے۔

۱۸۲۹ء میں تو حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ میدان والوں یعنی سکھوں کو پشاور شہر کے متعلق بھی خطرہ محسوس ہونے لگا تھا' سرحدی صوبہ کا دارالخلافہ تھا، وہاں کے صوبہ دار نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے دغا بازی سے امام صاحب کو زہر دینے کی کوشش کی اور اس افواہ نے کوہستانی مسلمانوں کے جوش کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیا' وہ نہایت ہی جوش وخروش سے میدانی علاقوں پر ٹوٹ پڑے اور کفار کی تمام افواج کو تہ تیغ اور اس کے جرنیل کو مہلک طور پر زخمی کر دیا، صرف شہر پشاور اس فوج کی وجہ سے بچ گیا جو شہزادہ شیر سنگھ اور جرنیل وینطور کی ماتحتی میں تھا، ایک لشکر جرار اپنے قابل ترین جرنیل کی سرکردگی میں روانہ کیا' جون ۱۸۳۰ء میں شکست کھانے کے باوجود امام صاحب کی فوج نے بہت بڑی قوت کے ساتھ میدانی علاقہ پر قبضہ کر لیا اور اس سال کے اختتام سے

پہلے خود پشاور کو بھی جو پنجاب کا مغربی دارالسلطنت تھا، فتح کر لیا۔ پشاور کے چھن جانے کا غم رنجیت سنگھ کے بے نظیر سیاسی تدبر کو بروئے کار لایا، اس چالاک سکھ نے معمولی معمولی ریاستوں کو ان کے اپنے مفاد کا واسطہ دے کر اسلامی فوج سے علیحدہ کرا دیا، اس صورت حال کو دیکھ کر امام صاحب پشاور کو خالی کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۸۳۱ء میں سکھ فوج نے جو شہزادہ شیر سنگھ کے زیر کمان تھی، ان پر اچانک حملہ کر دیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔

(ہمارے ہندوستانی مسلمان مصنف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر انگریزص: ۱۸، ۱۹، ۲۰)

جنگ بالاکوٹ

بالاکوٹ مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے آگے پہاڑی علاقہ میں واقع دریائے کنہار کے مغربی کنارے پر ہے‘ شیر سنگھ اور سید احمدؒ کی فوجیں دریائے کنہار کے پار ایک دوسرے سے مقابل ہوئیں‘ بالاکوٹ کا گاؤں دریا کے مغربی کنارے پر ایک ٹیلے پر واقع تھا‘ شیر سنگھ کی فوج کا پڑاؤ بالاکوٹ سے تھوڑی دور مشرقی کنارہ پر تھا‘ شیر سنگھ دو راستوں سے بالاکوٹ پر حملہ آور ہو سکتا تھا:

۱- بالاکوٹ کے مشرقی کنارے سے دریا پار کر کے۔

۲- پکھلی کی طرف سے بالاکوٹ کے مغربی پہاڑ پر چڑھ کر۔

مٹی کوٹ پہاڑی کے دامن اور بالاکوٹ کے آباد حصہ کے درمیان کھیتوں کا ایک نشیبی علاقہ تھا۔ سکھوں کے اقدام کو روکنے کے لئے اس نشیبی علاقہ میں بہت پانی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور اسے دلدلی بنا دیا گیا تھا۔ سید احمدؒ نے پہاڑی پر جانے والی پوشیدہ پگڈنڈیوں کی نگرانی کے لئے ایک مختصر سا دستہ تعینات کر دیا تھا‘ مگر یہاں بھی غداری اپنا کام کر گئی‘ پوشیدہ پگڈنڈیوں کا پتا سکھوں کو بتا دیا گیا اور کسی کمک کے پہنچنے سے پہلے محافظ دستہ کو اچانک زیر کر لیا گیا۔ مجاہدین کے نقشۂ جنگ پر یہ بہت بڑی ضرب تھی، کیونکہ اس کے فوراً بعد سکھ تمام پہاڑی پر چڑھ دوڑے جو بالاکوٹ پر سایہ فگن تھی۔

جنگ شروع ہوئی، مجاہدین کی مختصر فوج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم اور ایک دوسرے سے لاتعلق ہو گئی‘ جنگ جم کر ہوئی اور دست بدست۔ سید احمدؒ پہاڑی کے دامن میں بہادری سے لڑتے ہوئے گر گئے۔ کسی نے ان کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا، جو مجاہدین ان کے ساتھ لڑ رہے تھے وہ ان کے ساتھ شہید ہو گئے‘ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کی شہادت ۲۴ / ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ ۶ / مئی ۱۸۳۱ء تقریباً بروز جمعہ قبل از دوپہر ہوئی

معرکۂ بالاکوٹ میں سکھ فوجوں کی تعداد تقریباً کم و بیش بیس ہزار تھی، جب کہ بالاکوٹ میں موجود مجاہدین کی تعداد ایک ہزار بھی نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ ابتداء میں حضرت سید صاحبؒ کو بہت عمدہ کامیابیاں حاصل ہوئیں، مگر بعد میں اپنوں کی غداریوں‘ انگریزوں اور سکھوں کی مسلسل سازشوں وغیرہ سے کامیابیاں سست پڑ گئیں، اگرچہ مخلصین کا جوش و خروش بڑھتا ہی رہا، بالآخر ۱۸۳۱ء میں بمقام بالاکوٹ جنگ و جہاد کرتے ہوئے ایک سرحدی مسلمان کی سازش سے مع شاہ محمد اسماعیلؒ و دیگر رفقاء شہید ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

اب ہم مختصر طور پر چند باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

۱- یہ تحریک آزادی ہند ۱۸۰۶ء یا ۱۸۰۳ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند تک باقی رہی، اس کی جنگی کارروائی

صوبہ سرحد میں ۱۸۲۶ء میں شروع ہوتی ہے، چھ برس متواتر جنگ رہنے اور اکثر فتح مند ہونے اور اپنوں کی غداریوں کی بناء پر جبکہ ۱۸۳۱ء میں حضرت سید صاحبؒ اور شاہ محمد اسماعیل صاحبؒ اور بہت سے مجاہدین شہید ہو جاتے ہیں اور باقی ماندہ لوگوں میں سے بہت سے حضرات اپنے اپنے وطن کو واپس آ جاتے ہیں، تب بھی ایک جماعت مسلمان مجاہدین کی وہاں باقی رہتی ہے اور اپنی تمام جد وجہد کی کارروائیوں کو سرگرمی کے ساتھ عمل میں لاتی رہتی ہے، وہ مایوس نہیں ہوتی، وہ جماعت ہزاروں سے بڑھتے بڑھتے بعض اوقات لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے: ''جب ہم نے پنجاب کا الحاق کیا تو تعصب کی اس رو کا رخ جو پہلے سکھوں کی طرف تھا، ان کے جانشینوں یعنی انگریزوں کی طرف پھر گیا، سکھوں کی سرحد پر جس بدامنی سے ہم نے چشم پوشی کی تھی یا جس سے بے پروائی کی تھی، وہ ایک تکلیف دہ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچی تھی۔'' (باب اول ص:۲۳)

''۱۸۲۱ء میں امام صاحبؒ نے اپنے خلفاء کو منتخب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش وخروش کے مالک اور بہت ہی مستقل مزاج تھے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس کس طرح متعدد بار جب یہ تحریک ناکام ہونے کے قریب تھی، انہوں نے بار بار جہاد کے جھنڈے کو تباہی سے بچا کر از سر نو بلند کر دیا۔ پٹنہ کے خلفاء جو انتھک واعظ' خود اپنے آپ سے بے پرواہ' بے داغ زندگی بسر کرنے والے' انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمہ تن مصروف اور روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لئے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے۔'' (باب دوم ص:۶۳' ۶۴)

''روپیہ اور آدمی ہمارے علاقہ سے تھانہ کیمپ کو متواتر جا رہے تھے، اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط وکتابت بھی پکڑ لی تھی، یعنی انہوں نے کمال عیاری کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی، ان خطوط سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔ سرحد پر مجنونوں کے کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے جو باغیانہ نظام قائم تھا، اس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھیں بند نہ کر سکتی تھی' اسی سال یعنی ۱۸۵۲ء میں انہوں نے ہمارے حلیف ریاست رمب کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا، جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۵۳ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط وکتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔ ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے، جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی، اب ہم تقریباً انہی حالات سے دوچار تھے جو ۱۸۲۰ء و ۱۸۳۰ء کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور جس کے نتیجہ پر اس متعصب لشکر نے پنجاب پر اپنا تصرف اور قبضہ جما لیا تھا، یہاں تک کہ سرحدی دار الخلافہ ان کے قبضہ میں ہو گیا، اب جنگ سے گریز کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ ۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کر دینا کہ ۵۳ ہزار جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے، ایک ایک دن کی تاخیر دشمنوں کے تعصبی جوش، ان کی طاقت اور امیدوں کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ کمک کے باوجود ہمارے جرنیل کے لئے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔

ہفتوں تک برطانوی سپاہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈر کے مارے درے میں دبکی پڑی ہے اور وادی چومالہ میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔‘‘ (باب اول ص: ۲۴، ۲۵، ۲۸، ۳۴)

’’بہت مدت تک مجاہدین سرحد کی اس حیرت انگریز قوت کا سرچشمہ ایک راز بنا رہا، اس ہندوستان حکومت نے جو ہم سے پہلے پنجاب پر حکمران تھی یعنی سکھ، اسے تین مرتبہ منتشر کیا اور تین دفعہ یہ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے، لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک زندہ ہیں اور دیندار مسلمانوں کے معجزانہ طور پر زندہ رہنے کو ہی ان کے آخر کار غالب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جس وقت اس سرحدی نو آبادی کو ہم فوجی قوت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت ہماری مسلمان رعایا کے متعصب عوام ان لاتعداد آدمیوں اور روپیوں سے مدد دے کر گویا ان چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔‘‘ (باب دوم ص: ۴۲)

’’اب میں نے اپنی سرحد پر اس باغی کیمپ کی تمام تاریخ ۱۸۳۱ء سے جبکہ اس کی ابتداء ہوئی ۱۸۶۸ء تک جبکہ انہوں نے ہم کو جنگ میں دھکیل دیا، بیان کر دی ہے۔ وہ تمام پرانی مصیبتیں جو انہوں نے سکھ حکومت کے وقت سرحد پر نازل کی تھیں، وہ تمام ایک تلخ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچیں، اس نے تمام سرحد میں تعصبی جذبات کو برقرار رکھنے کے علاوہ تین مرتبہ قبائل کو یکجا اکٹھا کر دیا، جس کی وجہ سے برطانوی ہند کو ہر ایک موقعہ پر بہت ہی مہنگی لڑائیاں لڑنی پڑیں، یکے بعد دیگرے ہر گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ یہ ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ ہے، لیکن اس کے باوجود ان کو تباہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں، ہم نہیں جانتے کہ کس وقت ہم قبائل کی خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں آ جائیں گے جو وسط ایشیاء میں ہر وقت جاری رہتی ہیں، مگر اس وقت یہ عین ممکن ہے کہ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور افغانی جنگ لڑنی پڑے، یہ جنگ جب کبھی بھی ہوگی اور جلد یا بدیر ہو کر رہے گی تو ہماری سرحد پر غدار آبادی ہمارے دشمنوں کو ہزارہا آدمی مہیا کر سکے گی، ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے کوئی ڈر نہیں، اگر ہمیں ڈر ہے تو ان شورش پسند عوام سے جن کو یہ مجاہدین ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لئے بار بار اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔‘‘ (باب اول ص: ۴۱)

مندرجہ بالا واقعات جو کہ ایک اس دشمن انگریز کے بیانات کے اقتباسات ہیں جس نے اس بارہ میں بہت چھان بین کی ہے اور بہت سے امور کا خود معائنہ کیا ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کی اٹھائی ہوئی نہایت منظّم اور دیرپا اور موثر تھی اور اس نے تمام ملک میں اندر اور باہر ایسی بڑی ہلچل پیدا کر دی کہ مدبران برطانیہ لرزہ براندام ہو گئے، اس تحریک نے اس قدر جوش اور قربانی کے جذبات پیدا کر دیئے کہ جس کی نظیر اس ملک میں کبھی پائی نہیں گئی، یہ تحریک اور اس کے چلانے والے اس قدر عالی ہمت، مستقل مزاج، جفاکش اور منظّم تھے کہ انگریزوں کی انتہائی بربریت اور درندگی بھی ان کو فنا نہ کر سکی، اس تحریک کی رازداری اور اخلاص و دیانت داری اعلیٰ پیمانہ پر تھی، بے شمار مقدمات چلائے گئے اور ہر قسم کی شیطانی تدبیریں کام میں لائی گئیں، مگر انگریزوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر ہنٹر ص: ۲۰۷ باب دوم پر لکھتے ہیں:

’’۱۸۷۰ء میں جب ایسے دو ضلعوں کے مراکز کو توڑ دیا گیا تو ان کے رئیسوں کے خلاف غیر جانبدارانہ طور پر عدالت میں مقدمہ چلا گیا تھا، جہاں ان کو عمر قید بعبور دریائے شور یعنی کالا پانی اور ضبط املاک کی سزا ہوئی، اس وقت جو واقعات گواہیوں سے ظاہر ہوتے، وہ ہر اس غیر ملکی حکومت کو خوف دلانے کے لئے کافی ہیں جو انگریزی ہو، ہندوستان کی طرح اپنے آپ کو اتنی مستحکم خیال نہ کرتی

ہو۔ص:۶۷ پر لکھتا ہے: گذشتہ سات سال کے دوران میں ان غداروں کو یکے بعد دیگرے مجرم ثابت کر کے عمر قید بعبور دریا شور کی سزا دی گئی۔ الحاصل یہ کہ مجاہدین اور ان کے مددگار مسلمان وہ شریف النفس اور شریف اخلاق والے لوگ تھے جن کو ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر بار بار مجبور ہو کر انتہائی تعریفی کلمات سے یاد کرتا ہے، مگر ان کو ہر طرح ستایا گیا۔ ان کو سخت سے سخت سزائیں پھانسی' عبور دریائے شور' عمر قید' توہین وتذلیل وغیرہ کی دی گئیں، تاہم نتیجہ کیا ہوا؟ خود ڈاکٹر ہنٹر سے پوچھئے: لیکن ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ غداروں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے میں ویسا ہی ناکام ہوا، جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔'' (باب دوم ص:۸۹)

سرحد پر تباہ کن جنگیں اور اندرونی ملک میں عدالتی سزائیں اس قابل نہ ہوئیں کہ مجاہدین کے اتحاد کو توڑ سکیں۔ (ص:۹۳)

مندرجہ بالا تاریخی اقتباسات جو کہ عموماً صحیح ہیں، مبالغہ کا ان میں شائبہ بھی نہیں ہے، بلکہ واقعات سے بہت کم ہیں، ناظرین غور فرمائیں اور دیکھیں کہ مسلمانوں کی جدوجہد اور تحریک آزادی ہند میں جانبازی اور سرفروشی کس قدر عظیم الشان اور کس بلندی پر پہنچی ہوئی اور کس قدر پرانی ہے' کیا کوئی دوسری جماعت اس کے مقابل تاریخی اعتبار سے اپنا یا اپنی جماعت کا نام پیش کر سکتی ہے؟۔ ہر گز نہیں

۱- یہ جماعت حقیقۃً ۱۸۰۳ء سے وجود میں آئی یعنی جس وقت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ہندوستان دار الحرب ہے کا فتویٰ دیا۔

۲- اس جماعت نے کھلے بندوں آزادی کی تحریک کی قیادت کی اور لوگوں کو جہاد کے لئے آمادہ کیا۔

۳- اس جماعت نے ملک کے اکثر حصہ میں دورہ کر کے آزادی کا جوش وخروش پیدا کیا۔

۴- اس جماعت نے باقاعدہ تنظیم کی، ہر ہر ضلع' صوبہ اور قصبات وغیرہ میں مراکز بنائے اور عہدے دار مقرر کئے۔

۵- یہ جماعت سرحد تک کئی ہزار میل سفر کر کے جب کہ ریل' ہوائی جہاز' موٹریں نہ تھیں، ہر قسم کی تکالیف جھیلتی ہوئی ہزاروں جان فروشوں کو لئے ہوئے پہاڑوں' دشوار گذار دروں' ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے سندھ' قندھار' کابل' درہ خیبر صوبہ سرحد میں پہنچتی ہے، کیونکہ انگریز نے کسی دوسرے راستے سے جانے نہیں دیا تھا اور آزادی کی جدوجہد عملی طور پر شروع کرنی تھی۔

۶- یہ جماعت غریبوں کی ہے، اس کے پاس رسد وغیرہ کا پورا سامان نہیں ہے، فاقوں پر آدھے پیٹ کھانے پر موٹے جھوٹے پر گزارہ کرتی ہے اور پھر بھی دشمن پر یلغار کرتی ہے۔

۷- اس جماعت کی پارٹیاں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل سے مالی اور جانی امداد کرتی ہیں، راستہ میں انگریز پکڑتے ہیں ، سزائیں دیتے ہیں، مگر یہ نظام جاری ہے۔

۸- یہ جماعت انگریزوں کی طرف سے ہر قسم کی ہلاکتوں اور ایذاؤں کا نشانہ بنتی ہے اور تحمل کرتی ہے، مگر آزادی کی جدوجہد اور انگریز دشمن سے باز نہیں آتی، انگریز لالچ دیتا ہے قبول نہیں کرتی، انگریز ڈراتا ہے، مگر نہیں ڈرتی۔

۹- اس جماعت کو سرحدی قبائل نے انگریزی سازشوں میں آکر برباد کرنا چاہا، اس کے امام کو زہر دیا، میدان جنگ میں غدر کیا، کئی مرتبہ متفق ہو کر اس جماعت کے منتشر لوگوں کو جہاں پایا قتل اور شہید کیا، دشمنوں سے مل گئے مگر یہ سخت جان جماعت آزادی کی متوالی آج تک اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمی ہوئی ہے۔

۱۰- انگریزوں نے بار بار اس پر چڑھائی کی اور اس کے گھر بار کو بزعم خود جلا کر اور فنا کر کے چلے آئے پھر بھی وہ باقی ہے

اورلڑائیوں میں وہ پچاس ہزار ساٹھ ہزار، حتی کہ لاکھ تک مردان میدان کو انگریزوں کے خلاف افغانیوں کی مدد میں پیش کر دیتی ہے۔

۱۱-اس حال پر ایک صدی سے زیادہ اس پر گزرتا ہے، ہندوستان کے آزاد ہونے تک یہ اسی طرح جمی رہتی۔

(نقش حیات ص:۶۴۴ مصنف مولانا سید حسین احمد مدنیؒ)

☆☆......☆☆

چند مطبوعہ تفاسیر کی خصوصیات وامتیازات

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ
اردو ترجمہ: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

۲- حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد اسی خانوادۂ ولی اللہی کے فرد حضرت شاہ ولی اللہؒ متوفی: ۱۲۳۰ھ کے بیٹے شاہ عبدالقادر دہلویؒ اپنے والد بزرگوار کے نہج پر گامزن ہوئے اور ہندی اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ تحریر فرمایا، چنانچہ بہت بہترین اور عمدہ ترجمہ فرمایا۔ آج قرآن کے ترجمہ اور فہم میں ہندی باشندوں کا مدار اسی پر ہے۔

موصوفؒ نے اس ترجمہ کو تنقیح وتہذیب میں، اس کے اسلوب کی عمدگی اور معنوی لطافت ودقت میں ایسے بلند وبالا مرتبہ پر پہنچا دیا کہ وہ سہل ممتنع بن گیا.... کہ ایسا آسان اسلوب بیان جس کی نظیر ونقل نہ لائی جاسکتی ہو۔

پھر اس ترجمہ کو مفید تفسیری فوائد تحریر فرما کر مزید نفع بخش بنا دیا، جنہوں نے قرآن کریم کی اغراض ومقاصد کے عمدہ موتیوں پر پڑے پردوں کو کھول دیا، ان کے بعض لطائف وفوائد کی نظیر کتب تفاسیر کے موجودہ وافر وکثیر مادے میں ملنا مشکل ہے، چنانچہ ان تمام فوائد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے!!

شیخ کا ترجمہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے حد اعجاز کے قریب ہے، اور اگر بشری کلام بھی معجز ہوا کرتا تو بعض مواضع میں علامہ موصوفؒ کے ترجمہ کو معجز کہنا بالکل برمحل ہوتا، لیکن خداوند تعالیٰ نے صفت اعجاز کے ساتھ فقط اپنے کلام کو مختص فرما دیا ہے، لیکن بہرحال یہ خصوصیت ایسی ہے کہ دیگر تراجم اس کے مقابل ومساوی نہیں ہوسکتے ہیں۔

۳- اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین دہلویؒ، متوفی: ۱۲۳۳ھ.... جو شاہ عبدالقادرؒ سے بڑے تھے.... نے بھی قرآن کا اردو ترجمہ فرمایا، جس میں کلمات قرآن کی ترتیب کے مطابق لغوی ترجمہ کی رعایت فرمائی ہے اور عوام کے لئے یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ سے زیادہ بہتر ونفع بخش ہے۔

۴- اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سب سے بڑے بیٹے الحجۃ، عارف باللہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ متوفی: ۱۲۳۹ھ نے اپنے بعض احباب کو قرآن کریم کے آخری دو پاروں کی تفسیر لکھوائی، پھر پہلے پارے کی تفسیر لکھوائی اور دوسرے پارے کی تفسیر: **"وان تصوموا خیراً لکم"** تک مکمل فرما سکے اور اس تفسیر کا نام "الفتح العزیز" رکھا، اس میں ایسے بیش بہا علوم اور گرانمایہ فوائد ہیں جو ان کے وسیع تبحر علمی، ان کے محیر العقول استحضار، باکمال حافظے اور مضبوط وعمدہ تعبیرات کے متعلق قاری کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ فوائد علامہ محترمؒ نے کتب تفاسیر کی مراجعت کے بغیر زبانی حافظہ کی مدد سے تحریر کروائے ہیں، خدائے کریم کی قدرت بھی بڑی عجیب ہے، جس کو چاہے، جیسے کمالات چاہے، نوازش فرما دے۔ سبحان اللہ۔ ہمارے شیخ امام العصرؒ فرمایا کرتے تھے کہ کاش! یہ

تفسیر اسی طریق پر مکمل ہوجاتی تو مقدرت بشری کے اعتبار سے جو قرآن پاک کی تفسیری ذمہ داری ہم انسانوں پر عائد ہے، وہ پوری ہوجاتی۔

۵-بعدزاں تقریباً نوے یا سوسال بعد قرآن کریم کا بہترین ترجمہ حضرت علامہ شاہ اشرف علی تھانوی دیوبندیؒ نے فرمایا: جو حضرت قطب عارف باللہ مولانا یعقوب نانوتویؒ ،متوفی: ۱۳۰۰ھ ....جو اپنے زمانہ کے دارالعلوم دیوبند کے مدیر وصدر تھے....کے شاگرد رشید تھے۔حضرت تھانوی کو شیخ الہندؒ ....جن کا کچھ ذکر گذشتہ صفحات میں ہوا ہے....سے بھی تلمذ حاصل تھا،اس ترجمہ کے ساتھ حضرت تھانویؒ نے اردو میں چند مجلدات میں تفسیر بھی تحریر فرمائی ہے،جن میں بڑی مشقت اور خوب جدوجہد کے ساتھ دیگر تفاسیر کا مطالعہ فرمایا اور مفید امور کو اختصار کے ساتھ تحریر فرمایا اور مشکل مقامات کو نہایت عمدگی کے ساتھ حل فرمایا ہے،اور طلبہ کرام کے لئے عربی میں فوائد تحریر فرما کر اس کا نفع مزید بڑھادیا۔اس تفسیر کے لئے ''بیان القرآن'' کا نام تجویز فرمایا۔

۶-ان کے بعد حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندیؒ نے قرآن کریم کا ترجمہ فرمایا اور اس ترجمہ کے ساتھ تفسیری فوائد بھی رقم فرمائے۔

۷-پھر جب حضرت شیخ الہندؒ آزادی وطن کی تحریک کے سلسلے میں مالٹا میں اسیر ہوئے تو تمام تر مشغولیات سے فارغ ہوکر قرآن کریم کے مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف ہوئے ،اس وقت حضرتؒ نے عصری رائج اردو کے اسلوب کے مطابق ترجمہ وتفسیر قرآن کی دینی ضرورت محسوس فرمائی،چنانچہ ترجمہ تحریر فرمانا شروع کیا اور اسیری ہی کے زمانہ میں مکمل فرما کر اس ترجمہ کا حق ادا کردیا،اس ترجمہ کی بنیاد حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ پر رکھی،جو اس وسیع میدان کے سب سے پہلے شہسوار تھے،اس ترجمہ کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ کا خیال تھا کہ:علم وکمال کے اعتبار سے اس پر غالب آنا اور اس سے آگے بڑھنا تقریبا محال ہے،لیکن چونکہ حضرت شیخ الہند بھی خوب باریک بین اور فکری لطافت کے حامل تھے اور ان کا سینہ اور دل نور ایمان سے ایسا معمور ومنور تھا کہ ان کی منزلت پر پہنچنا ان کے زمانہ میں ممکن نہیں تھا، بلکہ ان کی گرد پا تک پہنچنا بھی دشوار تھا،انہوں نے بعض تعبیرات کو نہایت ہی نفاست اور خوش اسلوبی سے تبدیل کیا اور تمام ان خصوصیات کی رعایت ملحوظ رکھی جو شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں تھی،چنانچہ ترجمہ میں صفت، بدل اور عطف بیان کے درمیان فرق کی رعایت کی اور جو مقام سب کا احتمال رکھتا ہو تو وہاں لطافت معنوی دیکھ کر جو ترجمہ مقام کے لائق ہو وہ ترجمہ فرمادیا،علاوہ ازیں یہ ترجمہ دیگر کئی محاسن وخصوصیات کا حامل ہے جو دل بہادینے والے ہیں اور جتنا غور وتدبر کیا جائے،اس کے اچھے محاسن نمایاں ہوتے رہتے ہیں:

غراء مبسام كأن حديثها در تحدر نظمها منثور

ترجمہ:''محبوبہ کا تبسم بہت خوشنما ہے،گویا کہ اس کی باتیں ایسے موتی ہیں جن کا نظم وشعر بھی نثر ہے''

اور جیسا کہ ابونواس کہتا ہے:

يزيدك وجهه حسناً اذا ما زدته نظراً

ترجمہ:۔جتنا زیادہ اے مخاطب! تو محبوب کے چہرے کو دیکھے گا،اتنے محاسن اس کے تجھ پر نمایاں ہوں گے

اسی طرح ایک اور عرب شاعر کا جو عرب کے جھنڈے کا اٹھانے والا شمار کیا جاتا ہے،کا شعر ہے کہ:

"ورحنا يكاد الطرف يقصر دونه   متى ما ترقى العين فيه تسهل"

ترجمہ:۔"ہم اتنا چلے کہ پھر بھی نظریں اس کی انتہاء کو نہ پہنچ سکیں۔جب بھی نگاہیں اس میں اوپر کو اٹھتی ہیں،تو نیچے کی طرف لوٹ آتی ہیں"۔

بعدزاں شیخ الہندنے اس ترجمہ پرتفسیری فوائدتعلیق فرمانا شروع کیئےاورسورۂ نساء کےاخیرتک پہنچ گئے،اوراس میں نص قرآنی کےفہم کے لئے ایک عام شخص کوجتنی تشریحات کی احتیاج ہوتی ہے،وہ تمام تر فوائد کے ذیل میں عجیب طریقے سے روشن تعبیرات کےساتھ قرآن کریم کےاغراض ومقاصدکوواضح فرمایا۔

اسیری اورقید وبند سے جب حضرت شیخ الہندؒ کونجات ملی اور سرزمین ہند پہنچے توان پرمختلف امراض کا شدید حملہ ہوا ،بہرحال اجل مقدر نے ان کومہلت نہ دی اور قضا کا وقت قریب ہوا،فضاءتنگ ہوگئی اور شیخ الہندؒ ۱۳۳۹ھ میں حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ کی وفات کے پورے ایک سوسال بعدرفیق اعلیٰ کوواصل ہوئے

ناگاہ حوادث نے سورۂ آل عمران کےفوائدضائع کردیئےاوریہ تفسیریوں ہی نامکمل رہی اورکوئی عبقری شخصیت ایسی نہ ہوئی جوحضرت شیخ الہندؒ کےان تمام فوائدتفسیریہ کوان کی منشاء کےمطابق پایۂ تکمیل تک پہنچادے تاآں کہ یہ ازلی سعادت ان کے شاگردرشیداورخصوصی رفیق محقق العصرحضرت مولاناشبیراحمدعثمانیؒ صاحب فتح الملہم کےحق میں ظاہرہوئی،چنانچہ علامہ عثمانیؒ نے تین سال کی مدت میں تمام قرآن کریم کےفوائدشیخ الہندؒ کے اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے مکمل فرمائے اور ایسے کلمات وتعبیرات سےفوائدکومزین فرمایاجوسارے کےسارے گویاکہ لعل وجواہرہیں،ان تفسیری فوائدمیں زمانہ کی ضرورت کےمطابق باطل فرقوں کے مردود،بےکاراقوال کے بطلان کوواضح فرمایا،جیسےمحمدعلی قادیانی لاہوری،جس نے اردواورانگریزی میں "بیان القرآن" کےنام سےتفسیرلکھی اوراس کے مانند دیگراہل بدعت،ان فوائدکاکچھ تذکرہ گذشتہ صفحات میں بھی آچکاہے۔فتذکرہ

یہ مذکورہ تراجم اہل حق علماء کے ہیں اورمستندتراجم ہیں،جن سے خداوندکریم نے امت کو بہت بہرورفرمایا،اوراقلیم ہند کےتمام علاقوں میں ان تراجم پرقرآن فہمی کامدارٹھہرااوردیگرعلاقوں میں ان کی خوب نشرواشاعت ہوئی،علماءوطلباءجوشعبۂ درس وتدریس سےمتعلق تھےاورہیں،ان سےخوب نفع اٹھاتے رہے ہیں،خاص طورپرآخرالذکرترجمۂ شیخ الہندؒاوران کےتفسیری فوائد خوب مقبول ہوئے،اسی اثناءمیں اوراس تفسیر کےبعدبھی قرآن کریم کےتراجم اوران پرتفسیری فوائدتحریرکیئےگئے۔جن میں بعض صحیح اہل حق کے تھے

۸-ان میں مولاناشیخ حسن علی پنجابیؒ کا ترجمہ قرآن بھی قابل ذکر ہے،مولاناموصوفؒ قطب زمان مولانا محدث ابومسعودرشیداحمدگنگوہی دیوبندیؒ متوفی:۱۳۲۳ھ کےشاگردتھے،بعدازاں ان کےتحریرکردہ فوائدوامالی کومیں نے قابل مؤاخذہ ونقدپایا،جن میں ان کاقلم سیدھی راہ سےزلت کاشکارہواہے'لیکن یہ معلوم نہ ہوسکاکہ آیایہ ضبط کرنے والی کی طرف سے ہے یاخود صاحب تعلیق کی رائے ہے،بہرحال اس پرنظرثانی کی گئی ہےچنانچہ بعض مواضع تفسیری تقصیرپرتنبیہ کےمحتاج معلوم ہوتے ہیں،جن میں چندمواضع یہ ہیں:

۱-ذبح بقرہ والی آیت۔۲-فاتوا بسورة من مثله. ۳- لاتقولوا راعنا. ۴-تحویل قبلہ کےمتعلق تفسیری فائدہ۔

۵-ومن یکفر بالطاغوت. ۶-آیت الکرسی وغیرہ یہ مواضع لائق تنبیہ ہیں۔
اور میں نے کچھ عرصہ قبل سنا کہ کسی ہندی عالم نے ان کی تفسیر وترجمہ کے رد میں باقاعدہ ایک کتاب تالیف فرمائی ہے۔ فالی اللہ المشتکی

۹-اسی ترجمہ وتفسیر کی طرح حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا ترجمہ قرآن وتفسیری فوائد بھی قابل تحسین ہیں۔

ہندوستان کے بعض مفسرین نے درست ونادرست کی آمیزش سے بھی تفسیر مرتب کی ہے، جن میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ سرفہرست ہے، انہی ہندی مفسرین میں سے بعض نے قرآن کی مراد میں تحریف بھی کی ہے اور معنوی اعتبار سے گویا قرآن کو مسخ کردیا ہے، قرآن کو اپنی خواہشات کے قالب میں ڈھال کر اپنے واسطے جہنم کا ٹھکانہ تیار کیا ہے، جیسے محمد علی قادیانی جس کے متعلق گذشتہ سطور میں کچھ اشارہ کیا گیا، اس نے اپنی تفسیر میں سرسید احمد خان دہلویؒ ....جو علیگڑھ یونیورسٹی کا بانی تھا....کی تفسیر پر اعتماد کیا، اسی طرح حکیم احمد حسن امروہی مرزائی قادیانی ہے، جس کی تفسیر کا نام جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، غالباً ''غایۃ البیان'' تھا جس میں موصوف نے باطل اقاویل خوب ذکر کئے ہیں اور خوب لوگوں کو گمراہ کرنے کی سازش کی ہے۔

انگریزی کالج کے بانی سرسید احمد خان اوران کی تفسیر

چونکہ سرسید احمد خان کی تفسیر کے متعلق تذکرہ چلا، اس لئے اگر ان کی شخصیت اوران کی تحریر کردہ تفسیر کے متعلق وضاحت نہ کی جائے تو یہ مذہبی مداہنت اور عملی نفاق ہوگا، اس لئے کہ وہ بہت سے ایسے باطل پرست روشن خیال لوگوں کے رہبر ورہنما ہیں، جن کے لیے ملت اسلامیہ کی سیدھی اور ستھری راہ تاریک کردی گئی ہے، سرسید احمد خان زندیق اور ملحد شخص تھے یا پھر جاہل گمراہ، حق کی جانب راہ روی کے خواستگار تھے، لیکن سیدھی راہ ان سے خطا ہوگئی، انہوں نے شرعی معاملات اور شعائر ملت کے متعلق اپنی گمراہ اور ناکارہ عقل کو کسوٹی ٹھہرایا، جس کی بنا پر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، ان کا طرز وطریقہ یہ تھا کہ اہل یورپ ومغرب، ملت اسلامیہ پر جو بیکار اعتراضات کیا کرتے تھے، موصوف ان کو قبول کرتے تھے، پھر قرآن وسنت میں تاویلات کرتے ،اوراسلام کو کفر کے قریب کرکے دونوں کو ایک ہی دین بتلاتے ،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف یہ تمام تر تاویلات اس لئے کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ ان کافروں کے دربار میں جن کے ہاتھ میں ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور تھی، تقرب اور شرف باریابی حاصل کرلیں۔

چنانچہ انہوں نے فرشتوں کا انکار کیا اور کہا کہ: ملائکہ خیر کے فطری ملکہ کا نام ہے جو انسانی فطرت وجبلت میں ودیعت ہے، یہ کوئی مستقل عالم سے عبارت نہیں جو وجود انسانی سے کوئی خارج شئ شمار کیا جائے، بلکہ یہ ان صفات میں سے ہے جو انسان کے اندر ہی موجود ہیں۔

اسی طرح شیطان کا بھی انکار کیا اور کہا کہ:''شیطان اس شری ملکہ سے عبارت ہے جو فطرت انسانی کا حصہ ہے، اسی طرح حشر اور معاد جسمانی کا انکار کیا، بلکہ ملحد فلاسفہ کی طرح صرف معاد روحانی کا قائل ومعتقد ہوا اوراسی طرح آسمانوں اور ارواح کے وجود کا بھی منکر ہوا۔

موصوف شرعی نبوت ...جو خدائی عطیہ ونوازش ہے ....کے بھی منکر تھے، جو نبوت حضرت خاتم النبیین ﷺ پر جاکر تمام

ہوئی، وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ: یہ نبوت کسبی ہوتی ہے، انہوں نے نبوت کی صفات وعلامات میں تحریف وتبدیل سے کام لیا، نبی اورکسی بھی امت کے عام مصلح کو برابر قرار دیا، چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، اسی طرح ان معجزات کا بھی انکار کیا جو انبیاء کرام کے ہاتھوں سے خداوند کریم وقدیر کی قدرت سے ظاہر ہوئے کہتے ہیں کہ: ’’خوارق کا ظہور خداوند کریم کے دست قدرت سے بالاتر ہے، گویا کہ موصوف نے تکلیف وتشریع کی بنیاد ہی کو باطل قرار دیا، بلکہ تمام قطعی ضروریات دین اور صریح صحیح قطعی نصوص کی بھی تاویلات کیں، جن کی قطعیت دلالت وثبوت کے اعتبار سے مسلم ومتفق ہے، حتی کہ میرٹھ کے ایک خطاب میں کہنے لگے کہ: دنیوی معاملات تو خود اسلام نے ہمارے سپرد کر رکھے ہیں کہ جس طرح چاہیں جیسے چاہیں ان کے متعلق تصرف کریں، اس لئے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمادیا ہے کہ: **انتم اعلم بامور دیناکم منی**‘‘ تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو، جہاں تک دینی معاملہ کا تعلق ہے تو اس میں خوب وسعت وکشائش رکھی گئی ہے، فرمایا گیا کہ: ’’**من قال: لا اله الا الله دخل الجنة وان زنی وان سرق ،الحدیث**‘‘ جس شخص نے کہا کہ: خدائے برحق کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جنت میں گویا داخل ہوگیا، اگرچہ زنا یا چوری کا مرتکب ہو۔ (جاری ہے)

☆☆.....☆☆

ایک بے سند ’’حدیث قدسی‘‘ کی تحقیق

مولوی محمد اسد اللہ ☆

عرصہ سے ایک ’’حدیث قدسی‘‘ زبان زد خاص وعام ہے، اور خوب شہرت حاصل کرچکی ہے۔ حالانکہ یہ حدیث اس درجے اور مقام کی نہیں ہے کہ اس کو بیان کیا جاسکے۔ ذیل میں اس حدیث کی تخریج کی جاتی ہے‘ تاکہ اس کی اسنادی حیثیت اور مقام واضح ہو۔

اردو میں اس ’’حدیث قدسی‘‘ کا مفہوم یہ ہے:

> ’’اے میرے بندے! ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے، اگر تو میری چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کردے تو میں تیری چاہت میں تیری کفایت کروں گا اور ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ اور اگر تو میری چاہت پر اپنی چاہت کو قربان نہ کرے‘ تو میں تم کو تیری چاہت میں تھکا دونگا اور ہوگا وہی جو میں چاہوں گا‘‘۔

ذخیرۂ کتب میں دستیاب فہارس وسی ڈیز(CDS) کی مدد سے یہ حدیث قدسی جن کتابوں میں مل سکی ہے‘ وہ درج ذیل ہیں:

۱- نوادر الاصول للحکیم الترمذی‘ المتوفی: فی حدود سنة ۲۹۰ھ ص: ۱۶۱‘ ۴۳۳‘ طبع: المکتبة العلمیة بالمدینة المنورة لمحمد النمنکانی ۱۲۹۳ھ.

۲- المرقاة‘ شرح المشکوٰة‘ للعلامة علی القاری‘ المتوفی: ۱۰۱۴ھ‘ ۸/۶۲‘ باب اسماء الله تعالی‘ و۸/۲۰۰ باب الاستغفار.

۳- تفسیرروح البیان‘ لإسماعیل حقی بن مصطفی الصوفی الحنفی‘ المتوفی سنة: ۱۱۲۷ھ ۶/۶۸‘۲۱.

۴- الانصاف للقاضی محمد بن الطیب الباقلانی‘ المتوفی: ۴۰۳ھ ۱/۶۳.

☆ متخصص فی الحدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی (۵)

۵- حاشیة الصاوی‘ احمد بن محمد‘ المتوفی: ۱۲۴۱ھ علی شرح الجامع الصغیر ۱۱/۳۲۵.

۶- شرح النیل وشفاء العلیل فی الهبة والوصایات (فقه الإباضیة) تألیف: محمد بن یوسف

اطفیش المعزی، المتوفی: ۱۳۳۲ھ ۱۵۸/۳۴.

۷- احیاء العلوم للغزالی، المتوفی سنة: ۵۰۵ھ ۴۳۷/۳.

۸- ایقاظ الهمم شرح متن الحکم، تألیف: الصوفی احمد بن محمد ابن عجیبة الفاسی، المتوفی فی حدود: ۱۲۶۶ھ ۳۹/۱.

۹- قوت القلوب فی التصوف لابی طالب محمد العجمی المکی، المتوفی سنة: ۳۸۶ھ ۳۸۴/۱.

۱۰- فتاویٰ السبکی، رقم الفتوی: ۳۱۷۱.

نوٹ کتابوں کی یہ طبعات مکتبۃ الشاملۃ سی ڈی (CD) کے موافق ہیں)۔

''نوادرالاصول'' میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''قال اللّٰہ لداود علیه السلام : ترید وارید ،ویکون ما ارید، فإن أردت ما أرید، کفیتک ما ترید ،ویکون ما أرید ،وإن أردت غیر ما أرید عنیتک فیما ترید ویکون ما أرید''۔ (نوادر الأصول الأصل (۱۵۰) إن سعادۃ ابن آدم الاستخارۃ والرضی بالقضاء ص: ۱۲۱ وکذا فی الأصل ۲۸۹ فی تمثیل الحرص)

واضح رہے کہ مذکورہ جتنی کتب میں یہ حدیث درج ہے، ان میں سے کسی میں بھی اس حدیث کی سند درج نہیں ہے۔ ملاعلی قاریؒ متوفی: ۱۰۱۴ھ نے ایک جگہ مرقات میں یہ لکھا ہے:

''وفی بعض الکتب: عبدی'' (المرقات ۶۲/۸ باب أسماء اللّٰہ تعالیٰ) اور ایک جگہ یہ لکھ کر ذکر کیا ہے: ''وروی فی الحدیث القدسی'' (المرقات ۲۰۰/۸، باب الاستغفار) تفسیر حقی میں ''وجاء فی بعض الآثار: إن الله تعالیٰ یقول: ابن آدم'' کے بعد مذکور ہے (تفسیر حقی ۶۸/۶، ۲۱)

اور ''الانصاف للباقلانی ۶۳/۱ میں ''وقیل أوحی الله إلی بعض الأنبیاء'' کے ساتھ ذکر ہے۔

حاشیہ الصاوی، شرح النیل اور احیاء العلوم میں ''ویروی أن اللہ تعالیٰ أوحی إلی داود'' کے ساتھ مذکور ہے۔ شارح احیاء العلوم علامہ زبیدیؒ، متوفی: ۱۲۰۵ھ نے اس کی شرح میں صرف اس جملے پر اکتفاء کیا ہے: ''نقلہ صاحب القوت'' (اتحاف السادۃ للمتقین ۲۵۳/۹، طبع المطبعۃ المیمنیۃ) اور ''قوت القلوب'' میں ''کما روی فی أخبار موسی علیہ السلام'' کے ساتھ مذکور ہے۔ تمام جگہوں پر صیغہ تمریض کے ساتھ مذکور ہونا بھی عدم صحت کی دلیل ہے۔

مذکورہ کتابوں کے حوالوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس حدیث قدسی کی کوئی اصل وسند نہیں، لہذا جب تک اس حدیث قدسی کی مقبول سند کا علم نہیں ہوجاتا، ضروری ہے کہ اس سے پرہیز کیا جائے، تاکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر افتراء وکذب بیانی نہ ہو، آپ ﷺ نے جس شدت کے ساتھ حدیثی کذب بیانی سے روکا ہے کسی اور چیز سے اس قدر شدت کے ساتھ نہیں روکا، متواتر حدیث میں سب سے بلند پایہ روایت میں ہے:

''من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار'' (صحیح مسلم ج:۱، ص:۷)

ترجمہ:...''جو مجھ پر جھوٹ گھڑے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے''۔

محولہ بالا کتب میں سے مؤخر الذکر (فتاویٰ السبکی رقم الفتوی:۳۱۷۱ تاریخ الفتوی:۶؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ) میں اس حدیث قدسی کے بارے میں درج ہے:

''السوال: ماصحة قول الله: يا عبدى انت تريد وأنا أريد' ولايكون إلا ما أريد' فإن سلمتنى فى ما أريد كفيتك فى ما تريد؟

الجواب: لم نقف على هذا الأثر مسنداً' ولكن ذكره الغزالى فى ''الاحياء'' بصيغة التمريض' فقال: ويروى: أن الله... وكذا ذكره الحكيم الترمذى فى نوادر الأصول''۔

یہ حدیث قدسی جن کتابوں میں ہے' ان میں سب سے قدیم تالیف ''نوادر الاصول'' ہے' بعد کی کتابوں میں یہ حدیث شاید اسی کتاب کے حوالہ سے آئی ہے' ''نوادر الاصول'' حکیم ترمذی کی تالیف ہے' حکیم ترمذی کا نام سن کر یا پڑھ کر بعض حضرات کو اس سے شبہ لگ جاتا ہوگا کہ اس سے مراد مشہور محدث امام ترمذی ہے' جن کی کتاب ''الجامع السنن'' پڑھی پڑھائی جاتی ہے' لیکن واضح رہے کہ یہ دونوں شخصیات الگ الگ ہیں' مشہور محدث کا نام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی ہے' اور حکیم ترمذی کا نام ابوعبد اللہ محمد بن علی بن الحسن الحکیم الترمذی ہے، ان کا انتقال سن: ۲۸۵ھ اور ۲۹۰ھ کے درمیان ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو: لسان المیزان ۷؍۳۸ تعلیق شیخ عبد الفتاح أبوغدہؒ۔

حکیم ترمذی تیسری صدی کے مشہور محدث ہیں' اسی وجہ سے علامہ ذہبیؒ نے ''تذکرۃ الحفاظ'' ۲؍۶۴۵ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہم ان کی تصانیف میں غیر معتبر اور بے اصل روایات نے جگہ پکڑ لی ہیں' اسی وجہ سے قاضی کمال الدین ابن العدیم المتوفی: ۶۶۰ھ مصنف ''بغية الطلب فى تاريخ حلب'' اپنی کتاب ''الكمحة فى الرد على ابى طلحة'' میں لکھتے ہیں:

''وهذا الحكيم الترمذى لم يكن من أهل الحديث' وروايته' ولا علم له بطرقه ولاصناعته' وانما كان فيه الكلام على اشارات الصوفية والطرائق ودعوى الكشف عن الامور الغامضة والحقائق' حتى خرج فى ذلك عن قاعدة الفقهاء' واستحق الطعن عليه بذلك والإزراء' وطعن عليه أئمة الفقهاء والصوفية' وأخرجوه بذلك عن السيرة المرضية' وقالوا: إنه أدخل فى علم الشريعة ما فارق به الجماعة' وملأ كتبه الفظيعة بالأحاديث الموضوعة' وحشاها بالأخبار التى ليست بمروية ولامسموعة' وعلّل فيها جميع الأمور الشرعية التى لايُعقَل معناها بعللٍ ما أضعفها وما أوهاها''۔

(لسان المیزان ۷؍۳۸۸ تحقیق عبد الفتاح أبوغدہ' طبع دار البشائر الإسلامیہ بیروت ۱۴۲۴ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ' المتوفی: ۸۵۲ھ نے ابن العدیم کی مذکورہ بالا جرح نقل کرنے کے بعد اس کو مبالغہ آمیز بتلایا ہے'

لیکن چونکہ ابن العدیم کی رائے ایک جماعت کی رائے سے مؤید ہے لہذا اس کو ذکر کئے بغیر نہ رہے چنانچہ فرماتے ہیں:

”قلت: ولعمری لقد بالغ ابن العدیم فی ذلک، ولولا ان کلامه یتضمَّن النقل عن الائمة انهم طعنوا فیه، لما ذکرته“۔ (لسان المیزان ۷/۳۸۸)

حکیم ترمذی کے مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو: أعلا النبلاء ۱۳/۴۳۹، تذکرة الحفاظ ۲/۶۴۵، طبقات الشافعیة الکبریٰ ۲/۲۴۵، المعرفة عند الحکیم الترمذی، تألیف عبد المحسن الحسینی طبع: دار الکتاب العربی بالقاہرة اور الحکیم الترمذی ونظریتہٗ فی السلوک، تألیف الدکتور أحمد عبد الرحیم الساتح، طبع: مکتبة الثقافة الدینیة القاہرة ۱۴۲۷ھ۔

☆☆.....☆☆

تصویر اور تبلیغ دین

مفتی رفیق احمد، بالاکوٹی

ٹی وی، وڈیو اور سی ڈیز وغیرہ میں دکھائی دینے والی شکلوں پر ممنوع اور حرام تصویر کے احکام کے اجراء یا استثناء کے لئے ان تصاویر کی حقیقت و ماہیت پر فنی تحقیقات سے بحث کرنا تو اہلِ فن کا کام ہے، ہمیں ان شکلوں کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے ظاہری صورتحال اور گردوپیش کے واقعاتی پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

۱- دیگر پہلوؤں سے قطع نظر باطل اس وقت ملکی اور عالمی سطح پر "میڈیا" کو مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے اور اس ہتھیار کو آگ وبارود سے زیادہ مؤثر سمجھا جا رہا ہے، ایسے حالات میں ہم ان ذرائع سے دور رہ کر ان کے میڈیا وار سے اپنا دفاع کیسے کر سکتے ہیں؟! اسلام کے متعلق شکوک وشبہات، بے بنیاد الزامات اور پروپیگنڈوں کا دفعیہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ یہ پہلو بھی غور طلب ہے، بلکہ ایسی حقیقت واقعی ہے جس سے انکار مشکل ہے۔

۲- جہاں تک ٹی وی، وڈیو اور سی ڈیز وغیرہ کی تصاویر کا تعلق ہے، اس حوالہ سے تصویر کی لغوی و اصطلاحی تعریفات کے پیچوں میں وقت صرف کرنے کی بجائے تصویر کے مرحلہ وار مختلف ارتقائی ادوار کو سامنے رکھا جائے اور تصویر کے مقاصد اور اہداف پر غور کیا جائے تو امید ہے مسئلہ بآسانی سمجھ آجائے گا، زیادہ الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں رہے گی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ تصویر سازی کی ابتدائی صورت مٹی، پتھر یا جمادات وغیرہ کے مجسمے ہیں جو آثار قدیمہ اور ثقافت کے نام پر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، پھر ہاتھ سے رنگ و روغن سے بھرپور تصویر سازی کا ایک طریقہ بھی متعارف ہوا اور اب بھی "فن مصوری" معروف ہے، اس سے آگے پھر کیمرے وغیرہ کا دور آیا جسے بحث وتمحیص کے بعد پرانی تصویر سازی اور مجسمہ سازی کی ترقی پذیر صورت تسلیم کرلیا گیا اور کیمرے سے محفوظ ہونے والی صورت پر "تصویر محرّم" کا حکم لگایا گیا، حالانکہ مٹی و جمادات سے بننے والی تصویر اور کاغذی تصویر میں بہت واضح فرق ہے، اب تصویر کشی کا یہ مقصد برقی لہروں کی وساطت سے حاصل ہو رہا ہے اور محفوظ ہو رہا ہے، جسے ہم وڈیو اور سی ڈیز وغیرہ کی مدد سے حسبِ منشاء دیکھ سکتے ہیں۔

مجسمہ سازی سے لے کر سی ڈیز کی تصاویر تک، ہر دور میں تصویر کا مقصد مُصوّر کے نقش ونگار اور شکل وشبہات کی شناخت وحکایت ہے، وڈیو اور سی ڈیز وغیرہ کی تصاویر اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کر رہی ہیں اور ان تصاویر میں عدم استقرار کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ وڈیو کیسٹ کا فیتہ یا سی ڈیز کی لہریں ان تصاویر کا مستقر ہیں، ہاں یہ ہے کہ یہ استقرار مجسموں اور کاغذی تصاویر کے استقرار سے زیادہ لطیف وباریک ہے جسے ہم سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی سے تعبیر کر سکتے ہیں، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وڈیو یا سی ڈیز کی تصاویر چونکہ مجسموں اور کاغذی تصاویر سے مختلف ہیں، لہذا یہ تصاویر محرمہ سے خارج ہیں، یہ بات قابل فہم نہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ استقرار کی شرط تصویر کے لئے محض اکابر کا اجتہاد ہے، کوئی منصوص ومنقول نہیں ہے، جس کے نتیجہ میں یہ کہا جاسکے کہ استقرار کی شرط نہ ہونے کی صورت میں مُصوّر کی حکایت کرنے والی شکلوں کو تصویر کے حکم سے خارج مانا جائے گا،

قطعاً ایسا نہیں۔

البتہ ''تصویر'' کو فی نفسہ ناجائز مانتے ہوئے بعض ضروری مواقع کا استثناء بہر حال ممکن ہے اور ضرورت پر عمل کے قواعد پر غور سے ضرورت کے احکام بیان ہوسکتے ہیں۔ بعض حضرات کے بقول دینی مقاصد کے لئے ذرائع ابلاغ کا مطلق استعمال جائز ہے' ان حضرات کی فکر کی اساس یہ ہے کہ باطل نے ذرائع ابلاغ کو اس طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے کہ وہ اپنی ہر گمراہ کن بات کو چند لمحوں میں پوری دنیا تک پہنچا سکتا ہے اور پہنچا رہا ہے اور اس دور میں احوال وافکار کو رخ دینے میں میڈیا سے مؤثر کردار کسی اور ذریعہ کا ہرگز نہیں' اس مکتب فکر کی اس منطق پر تبصرہ کئے بغیر دوسری رائے ذکر کرتے ہیں جس رائے کے حامل امت کے وہ علماء کرام ہیں جن کے تصلب فی الدین کی وجہ سے امت مسلمہ انہیں اپنا مقتدی اور پیشوا مانتی ہے' ان حضرات کی رائے کی بنیاد یہ ہے کہ اس حد تک تو تمام اہل علم متفق ہیں کہ موجودہ میڈیائی وسائل کا جائز استعمال کم اور ناجائز استعمال زیادہ ہے۔ دین و دنیا کے اصول کے مطابق ان کے استعمال کو جواز کا کلی سرٹیفکٹ نہیں دیا جاسکتا' جب یہ حقیقت مسلم ہے تو اس بات میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم دین کی نشر واشاعت اور تبلیغ وتعلیم کے لئے ناجائز ذرائع کے استعمال کے قطعاً مکلّف نہیں ہیں' بلکہ اس سے بڑھ کر یہ صراحتیں جابجا موجود ہیں کہ ازالہ منکر کے لئے منکر کو استعمال کرنا ناجائز ہے' مثلاً اگر کسی کے بدن یا کپڑے پر ناپاک چیز لگ جائے تو اسے پاک کرنے کے لئے ہر مائع چیز کا استعمال کافی نہیں ہوتا' بلکہ صرف وہ مائع ضروری ہوتا ہے جو خود بھی پاک ہو اور اس میں نجاست...ناپاکی...کو دور کرنے کی صلاحیت بھی ہو' مثال کے طور پر اگر کوئی شخص نجاست کے ازالہ کے لئے پیشاب استعمال کرے تو جسم والی نجاست مٹ بھی جائے، تب بھی پاکی کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ ناپاک چیز کے استعمال کی بناء پر پہلے سے موجود ناپاکی میں کمی تو نہیں آئی' بلکہ اضافہ ہوا ہے، لیکن اگر اسی مقصد کے لئے پانی استعمال کیا جائے تو بلاشبہ پاکی کا مقصد حاصل ہوجائے گا۔ بعینہ سمجھنا چاہئے کہ ہم منہیات اور منکرات کے میناروں پر چڑھ کر دفاع دین اور تبلیغ دین کے بلند و بانگ دعوے کس طرح کر رہے ہیں؟

پس دفاع دین اور تبلیغ دین کے حوالہ سے آسان اور سیدھا راستہ وہی ہے جس پر چلتے ہوئے ہمارے اسلاف نے ہمیں دین پہنچایا اور ہم مسلمان ہیں، یہ زمانی حقیقت ہے کہ اگر دنیا دجالی شر و فساد سے بھرنے جائے گی تو اسلامی امن وسلامتی اور خیر وعافیت کا دور بھی ضرور پلٹ کر آئے گا، ہمیں ہر اقدام سے پہلے انجام کے بارے میں بھی فکر مند ہونا چاہئے۔

اسلام میں پردے کی اہمیت

جناب مشتاق احمد، قریشی

اسلام اور اسلامی نظامِ حیات، ایک پاک وصاف معاشرے کی تعمیر اور انسانی اخلاق وعادات کی تہذیب کرتا ہے۔ اسلام نے جہالت کے رسم ورواج اور اخلاق وعادات کو جو ہر قسم کے فتنہ وفساد سے لبریز تھے، یکسر بدل کر ایک مہذب معاشرے اور تہذیب کی داغ بیل ڈالی، جس سے عام انسان کی زندگی میں امن، چین اور سکون ہی سکون در آیا۔ اسلام اپنے ماننے والوں کی تہذیب اور پُر امن معاشرے کے قیام کے لئے جو پہلی تدبیر اختیار کرتا ہے، وہ ہے: انسانی جذبات کو ہر قسم کے ہیجان سے بچانا، وہ مرد اور عورت کے اندر پائے جانے والے فطری میلانات کو اپنی جگہ باقی رکھتے ہوئے انہیں فطری انداز کے مطابق محفوظ اور تعمیری انداز دیتا ہے، قرآن حکیم میں سورہ نور میں بڑی وضاحت سے ایک ایک بات کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے، ہر عمل کی تہذیب کر دی گئی ہے، اس سورہ کی آیت نمبر: ۳۱ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وقل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولایبدین زینتھن الاماظھر منھاولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن ولایبدین زینتھن.''

ترجمہ۔''اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہے اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں''۔

سورہ احزاب: ۵۹ میں ارشاد ہے:

''یاایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ،ذلک ادنی ان یعرفن فلایؤذین ،وکان اللہ غفوراَرحیماَ''

ترجمہ:۔''اے نبی! ﷺ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں، یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں، اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے''۔

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں عورتوں میں زیب وزینت، بناؤ سنگھار اور بننا سنورنا رائج رہا ہے، یہ اس کی فطرت اور جبلت بھی کہی جاسکتی ہے، ہر عورت کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ بہت خوبصورت نظر آئے۔

ہر زمانے میں بناؤ سنگھار کے معیار بدلتے رہتے ہیں' لیکن زینت کا داعیہ چونکہ فطرت میں موجود ہوتا ہے' اس لئے عورت اپنے آپ کو خوبصورت سے خوبصورت بنانے کے تمام جتن اور حربے استعمال کرتی ہے' اسلام عورت کی اس فطرت پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگاتا' بلکہ اس کی اس خواہش اور فطرت کو تسلیم کرتا ہے' ہاں اس کی تنظیم وتہذیب کرتے ہوئے ضابطہ بندی ضرور کرتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ عورت کا تمام تر حسن وجمال' اس کی تمام زیب وزینت اور آرائش وسنگھار میں اس کے ساتھ صرف اس کا شوہر شریک ہو' کوئی دوسرا شریک نہ ہو' عورت اپنی آرائش اور جمال صرف اپنے مرد کے لئے کرے۔

اگر دیکھا جائے تو عورت درحقیقت تمام تر سنگھار وآرائش مرد کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اس کی خصوصی توجہ کے حصول کے لئے ہی کرتی ہے' اسلام ایسا دین ہے جو انسان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی تہذیب کرتا ہے' ان کے لئے پاکیزہ طریقہ وضع کرتا ہے' تاکہ کوئی مسلمان اور اہل ایمان کسی طریقے سے کسی برائی میں مبتلا نہ ہو اور ان کے میلانات جائز طریقوں تک محدود رہیں' اللہ ہی ہے جو تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے' جس سے انسانی فطرت کی نفسیاتی تعلیم وتربیت ہوتی ہے۔ عورت کے حسن وجمال کو اس کی زیب وزینت کو اللہ تعالیٰ نے اس کے شوہر کی دل بستگی اور توجہ کے لئے محدود کردیا ہے' تاکہ وہ اپنی ساری توجہ اپنی بیوی کی طرف مرکوز رکھے اور اس کی عورت غیروں کی ہوس ناک نظروں سے محفوظ و مامون رہے۔

اللہ تعالیٰ نے شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ یہ ان کی قربت اور ہم نفسی کی علامت ہے' اسلام جب پردے کی تاکید کرتا ہے تو اس سے مراد ایک نہایت پاک وصاف سوسائٹی کا قیام ہے۔

اگر ہم اپنے چاروں اطراف نظر ڈالیں تو بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ احکام الٰہی سے اعراض اور روگردانی کے کیسے کیسے بھیانک اور عبرت ناک مناظر سامنے آرہے ہیں۔

مغربی دنیا خصوصاً یورپ اور امریکی معاشرے میں جہاں کسی قسم کے پردے اور حجاب کا گزر نہیں' جہاں ہر طرف لطف اندوزی' ہیجان خیزی' شہوت پرستی اور گوشت پوست کی لذت اندوزی کا سامان ہو رہا ہے' ایسے ایسے اقدامات اٹھائے جارہے ہیں جن سے ہر وقت جنسی ہیجان پیدا کیا جارہا ہے' جس کے نتیجے میں جنسی پیاس بڑھتی جارہی ہے جو کسی طرح بجھتی ہی نہیں' انسان کی خوابیدہ حیوانیت کو جگا دیا گیا ہے اور انسان بے قید شہوت رانی کا شکار ہوگیا ہے' اس کے اعصاب اور نفسیات کے اندر ہیجان خیز امراض پیدا ہو رہے ہیں۔

مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لئے کشش ایک فطری امر ہے اور یہ انسان میں تخلیقی طور پر ودیعت کی گئی ہے' کیونکہ انسان کو اس زمین پر اپنے منصبِ خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے' اس زندگی کا بڑا اور اہم حصہ زمین پر زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے' اس لئے یہ کشش دائمی ہے۔ یہ کشش ہی انسان کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے' عورت اور مرد کے ملاپ سے ایک خاندان ایک گھرانہ وجود پاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ذریعہ فطری تسکین پاتے ہیں اور افزائش نسل کے ذریعے ایک خاندان کی تشکیل کا ذریعہ بنتے ہیں اور اگر کہیں دونوں فریقوں کے درمیان ناآسودگی رہے' اپنے فطری تقاضوں کی تسکین نہ کرسکیں تو پھر بے چینی اور بے قراری جنم لیتی ہے جو اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے اور انسان کو برائی کی طرف ابھارتی ہے۔

امریکہ اور یورپ کا معاشرہ ہمارے سامنے ہے جہاں ہر طرف ہر قسم کی جنسی آزادی عام ہے مرد عورتوں سے مطمئن نہیں عورتیں مردوں سے ناآسودہ ہیں جنسی تسکین وآسودگی کے لئے تمام غیر فطری طریقے استعمال کرنے کے باوجود ناآسودگی سے دوچار ہیں مرد مردوں سے عورت عورتوں سے اور حیوانات تک سے اختلاط وملاپ کے باوجود ایک ہیبت ناک ناآسودگی کا شکار ہیں۔ وہاں کھلے عام ہر قسم کی بے پردگی فحاشی عریانی اور تمام غیر فطری طریقوں کے باوجود جو بے چینی اور بے کلی عام پائی جاتی ہے اسلام اپنے ماننے والوں کو ان تمام خرابیوں سے بچاتا ہے اور بچائے رکھتا ہے۔

ایسے تمام ممالک جہاں ہر قسم کا جسمانی ملاپ عریانی اور جنسی بے راہ روی عام ہے ہر قسم کی قیدو بند سے وہ آزاد ہیں ان کے نزدیک تمام ممکن شکلیں جائز ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی جنسی پیاس جنون کی حد تک بڑھ گئی ہے اور ان کی تسکین کا نام ونشان تک مٹ گیا ہے جس کے باعث وہاں جنسی اور نفسیاتی بیماریوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا ہے ایسے تمام مسائل سے وہ معاشرے دوچار ہیں جو جنسی محرومی ناآسودگی سے پیدا ہوتے ہیں اس کے باوجود وہاں جنسی تعلقات اور ملاپ مویشیوں اور حیوانات کی طرح راستوں پر عام دیکھا جاسکتا ہے جب کہ اسلام جو انسان کے ہر جذبے کی نا صرف تطہیر کرتا ہے بلکہ انہیں پاک صاف کرتا ہے انہیں تہذیب وشائستگی سے ہم کنار کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ایک آسودہ اور پُرسکون زندگی بسر کرنے میں بھی مدد فراہم کرتا ہے۔ عورتوں کا بے پردہ ہونا بے حجاب ہونا فیشن کو اپنانا بن سنور کر غیر مردوں کے سامنے آنا انہیں دعوت نظارہ دینا بے پردگی اور بے حجابی کے نام پر شعائر اسلامی کو پامال کرنا یہ سب اسلامی نہیں مغربی اور غیر اسلامی معاشرت اور روایات ہیں جن کے بھیانک نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

اسلام نے اسلامی معاشرے کا ذوق ہی بدل دیا ہے لوگوں کے جمالی احساسات کو بدل دیا ہے اسلام کے ماننے والوں کے لئے حسن و جمال کی تمام حیوانی ادائیں مطلوب و مستحسن نہیں رہیں بلکہ اسلام حسن و جمال کا ایک مہذب رنگ ڈھنگ اور معیار قائم کرتا ہے جس میں ہر طرح کی عریانی سے بچا جاتا ہے اور سنجیدگی وقار اور پاکیزہ جمال کا ذوق پیدا کرتا ہے جو انسان کے اور ایک اہل ایمان کے لائق ہوتا ہے۔ اسلام ایک سچی مومنہ عورت کی تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ وہ نا صرف اپنے حسن و جمال کا درست طریقے سے استعمال کر سکے اور اپنی تمام معاشی معاشرتی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اپنی فطری جبلی ضرورتوں اور تقاضوں کو بھی فطرت کے عین مطابق پورا کر سکے۔

آج دور جدید کی بظاہر ترقی یافتہ خواتین دو مردوں کے شانہ بشانہ ہم قدم ہو کر چلنا پسند کرتی ہیں اور بے حجابی و بے پردگی کی علمبردار ہیں۔ اگر وہ اپنی دیانتداری سے خود اپنا جائزہ لیں اور اپنی نگاہ میں ایک دقیانوسی باپردہ باشرع خاتون کا جائزہ لیں تو انہیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے میں انہیں کیسی کیسی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں کیسی کیسی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور دن بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد رات اپنے شوہر کی قربت میں بسر کرتی ہیں تو کیا وہ دونوں جسمانی وروحانی طور پر جنسی ونفسانی طور پر اس قدر آسودہ و مطمئن ہو پاتے ہیں جس قدر ایک پردہ نشین وخانہ دار خاتون اپنے خلوص سے آسودگی اور طمانینت حاصل کرتی ہے؟ اس کی یہ آسودگی یہ طمانینت واطمینان اسلامی شعائر پر عمل پیرا ہونے کے

باعث ہوتی ہے، وہ اپنے گھر تک محدود ہو کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل پیرا ہو کر خود کو اپنے گھر تک محفوظ و مامون رکھ کر اپنے گھر، اپنے بچوں کی تہذیب و تربیت کر کے جس آرام و سکون کو حاصل کر لیتی ہے، وہ کبھی بھی کسی بھی طرح ایک بے پردہ، بے حجاب خاتون جو در بدر پھرتی ہے، حاصل نہیں کر سکتی۔

پردے کے اسلامی احکام کا مقصد و مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو بے راہ روی، فحاشی، بے حیائی اور شہوانی فتنہ انگیزی سے بچائے اور وہ خفیہ شہوانی جذبات نہ بھڑکنے پائیں جو عورت کے بے پردہ ہونے سے بھڑک سکتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ہر مرد اور عورت کو سورت نور کا ترجمہ اور تفسیر سیکھنا چاہیے

حقوق نسواں اور مذاہب عالم

محمد یاسر حبیب اللہ مختار

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

''ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجة واللہ عزیز حکیم''

(البقرہ: ۲۲۸)

ترجمہ'': عورتوں کے لئے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں، البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ ...فضیلت ...حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب پر غالب اختیار رکھنے والا اور حکیم ہے''۔

دوسری جگہ اللہ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے:

''الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعض و بما أنفقوا من اموالھم''

(النساء :۳۴)

ترجمہ'': مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بناء پر کہ مرد اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں''۔

حقوق نسواں پر بحث وتمحیص صدیوں سے جاری ہے، لیکن کچھ عرصے سے اس میں کافی شدت آ گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے حقوق ہیں جن کے لیے خواتین یا ان کے خیر خواہ کوشاں ہیں؟ مزید یہ کہ آج تک عورت کو بحیثیت عورت جو مقام و مرتبہ حاصل رہا ہے، اس کے دلانے میں کس کا کیا کردار ہے؟

عموماً غیر مسلم دنیا میں عورتوں کے متعلق دو نظریے ملتے ہیں، اور دونوں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔

پہلا نظریہ: کہ عورت اوصاف حمیدہ کا ایک حسین مرقع، فرشتہ صفت، پیکر حیاء، ایثار و وفا کی مورت، عقیدت کا مجموعہ، سراپا شفقت اور زندگی کے تمام تر مسائل کا حل ہے، لیکن اس نظریے کا وجود درحقیقت شاعرانہ تخیل تک ہی محدود ہے۔

دوسرا نظریہ: اس کے برعکس ہے کہ: عورت ایک ناپاک وجود سے عبارت ہے، اور دنیا میں پائی جانے والی تمام تر برائیوں اور مصیبتوں کا اصل سبب اور بنیاد عورت کا وجود ہے، چنانچہ اس ضمن میں ایک یورپین مفکر کا قول ہے کہ:

''میں مرد کو اس وجہ سے پسند نہیں کرتا کہ وہ مرد ہے بلکہ اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ عورت نہیں ہے''

اسی طرح مشہور یونانی فلاسفر سقراط کے خیال میں ''عورت سے زیادہ فتنہ وفساد کی کوئی اور چیز نہیں''

ایک اور شہرت یافتہ یونانی فلاسفر افلاطون کے بقول:

''سانپ کے ڈسنے کا تو دنیا میں علاج موجود ہے، لیکن عورت کے شر کا کوئی علاج ممکن نہیں، اس لئے اگر ممکن ہو تو اس مجسمۂ شر کو ذلت کے آخری غار میں پھینک دو''۔

یونان کے ان قدیم فلاسفروں کے افکار اور نظریات کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں عورت کو باعث ذلت گردانا گیا اور یونانی لوگ عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بیچنے اور اسے ذاتی ملکیت کی طرح استعمال کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ روم، مصر، عراق، چین، عرب، ہندوستان، ایران ان تمام ممالک کے اندر صنف نازک کے ساتھ ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا، بازاروں اور میلوں میں اس کی خرید و فرخت کی جاتی رہی، ان سے حیوانوں سے بدتر سلوک کیا جاتا رہا، یونان میں تو ایک عرصے تک یہاں تک بحث کی جاتی رہی کہ اس کے اندر روح موجود ہے بھی یا نہیں۔ اہلِ عرب اس کے وجود کو ہی موجب عار سمجھتے تھے، بعض شقی القلب اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے، ہندوستان کے بعض علاقوں میں آج بھی یہ حال ہے کہ شوہر کی میت کے ساتھ عورتوں کو بھی زندہ جلادیا جاتا ہے، راہبانہ مذاہب اسے معصیت کا سرچشمہ، گناہ کا دروازہ سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے کو روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا جاتا تھا، الغرض یہ کہ دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں اس عورت کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی، وہ حقیر اور ذلیل سمجھی جاتی تھی، اس کے معاشی اور سیاسی کوئی حقوق نہیں تھے، وہ اپنی مرضی سے کسی قسم کا کوئی تصرف نہیں کرسکتی تھی، وہ ابتداء میں باپ کی پھر شوہر کی اور اس کے بعد اپنی اولاد کے تابع و محکوم تھی، ان کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی اسے اجازت نہیں تھی، اس پر ہونے والے ظلم و ستم کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں تھا اور نہ ہی اسے یہ حق اور آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم پر دادرسی کی طلبگار بنے۔

یہ تو قدیم تہذیبوں کا حال تھا جن میں عورت کو نہ تو کوئی مقام حاصل تھا اور نہ ہی اس کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم پر صدائے احتجاج بلند کرسکے، دورِ حاضر کی جدید تہذیب کے اندر بھی آزادئ حقوق نسواں کا جو ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے، اس کا حال بھی ان قدیم تہذیبوں سے کچھ مختلف نہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ صرف ظاہری لفاظی ہے، حقیقت حال وہی ہے جو دورِ قدیم میں تھی، اس لیے کہ دورِ قدیم میں عورت سے جو کام اسے سامان عیش اور خادمِ بے مول کہہ کر لیے جاتے تھے، دورِ جدید میں وہی کام اس سے حقوق نسواں کے خوبصورت نعروں کی آڑ میں لیے جارہے ہیں۔ آج عورت کو گھر کی پاکیزہ اور محفوظ چہار دیواری سے کھینچ کر اسے شاہراہِ عام پر لایا گیا ہے۔ لیکن وہ عورت آج بھی اسی نوعیت کے مظالم اور مسائل کا شکار ہے جن مسائل اور مظالم کا شکار دورِ قدیم کی عورت تھی۔ بحیثیتِ نوع، عورت کے حالات میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا وہ مظلوم کی مظلوم ہی رہی، اس کے حقوق پر آج بھی دست درازی کی جارہی ہے۔ آزادئ نسواں کے نام پر گھر کی چاردیواری سے باہر لائی جانے والی عورت پر آج بھی گھر کی ذمہ داریاں اسی طرح برقرار ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک اور فکر بھی لاحق ہوگئی ہے وہ فکر اپنے معاشی انتظام کی ہے جس کے حصول کے لئے کوشاں یہ عورت جب معاشرے میں قدم رکھتی ہے تو نا صرف یہ کہ اسے اپنی عزت کی بقاء بلکہ ذریعۂ کفالت کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور آئے دن اسے اس کے لئے جس قسم کے تشویشناک مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ مسائل کسی سے مخفی نہیں۔

مقام حیرت ہے کہ مغربی تہذیب کے دل دادہ خود عورت کے ساتھ جس قسم کا ناروا سلوک روا رکھتے ہیں، اس کے سامنے دورِ قدیم کے مظالم بھی محض فرسودہ لگتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کا الزام دوسروں کے سر ڈالنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

جہاں تک اسلام میں حقوق نسواں کا تعلق ہے، اگر ہم اس صورت حال کو اس طرح دیکھیں، جس طرح اس کی عکاسی مغربی ذرائع ابلاغ کی جانب سے کی جارہی ہے تو لامحالہ ہمیں بھی اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ اسلام نے جو حقوق خواتین کو دیئے ہیں وہ واقعی فرسودہ اور ناکافی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں خواتین کی آزادی کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ درحقیقت عورت کے احترام کی نفی اور اس کی روح اور جسم کا استحصال ہے، جس پر آزادیٔ نسواں کا خوش نما پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مغربی معاشرہ مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ خواتین کو حقوق دیے جائیں، لیکن خود اس معاشرے نے خواتین کو کیا دیا ہے؟ یہی کہ عملی طور پر اسے داشتہ اور طوائف کی سطح پر لے آیا ہے، اسے ایک ایسی شئے بنا ڈالا ہے جس سے مرد لطف اندوز ہوتے ہیں، آرٹ اور کلچر کے خوبصورت پردوں کے پیچھے اس کا کس قدر استحصال کیا جاتا ہے کہ عملاً وہ جنس کے متلاشیوں اور کاروباریوں کے ہاتھوں کھلونا بن کے رہ گئی ہے، جس کا اسے احساس بھی نہیں۔ جبکہ اس کے برعکس آج سے چودہ سو برس پہلے عہدِ جاہلیت میں، اسلام کی انقلابی تعلیمات نے عورت کو اس کے حقیقی حقوق اور مرتبۂ عزت عطا کیا، اسلام کا مقصد ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ خواتین کے حوالے سے معاشرے کی سوچ، خیالات، احساسات اور طرزِ زندگی میں بہتری لائی جائے، معاشرے میں خاتون کا مقام بلند سے بلند تر کیا جائے۔

اس وقت دنیا کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، مسلمانوں کی یہ آبادی بہت سے معاشروں میں تقسیم ہے، ان معاشروں کا طرزِ زندگی یکساں نہیں ہے، کچھ معاشروں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جاتا ہے اور کچھ معاشرے اسلامی تعلیمات سے دور ہیں۔ اسلام میں خواتین کے کیا حقوق ہیں؟ اس بات کا فیصلہ ان مسلمان معاشروں کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سلسلے میں شریعت اسلامی کے حقیقی مصادر سے رہنمائی لی جائے گی، اسلامی تعلیمات کے مستند اور بنیادی مصادر قرآن و سنت اور اجماع صحابہ ہیں۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں اسلام میں عورتوں کے کیا حقوق ہیں؟

اسلام مرد اور عورتوں کو مساوی حقوق دیتا ہے، لیکن یہ حقوق مساوی ہیں، یکساں نہیں ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تو مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے تکمیل کا ذریعہ ہیں، ان کے درمیان باہمی شراکت کار ہوتی ہے، گویا اگر دونوں اپنا اپنا کردار اسلامی احکام کے مطابق ادا کریں گے تو ان کے درمیان نہ کبھی رقابت ہوگی اور نہ مخالفت۔ اسلام نے عورت کو وہ تمام حقوق عطا کیے ہیں جو اس کا بنیادی حق ہیں، دیگر ادیان باطلہ کی طرح اسلام نے عورت کے حقوق کی کبھی نفی نہیں کی، بلکہ عورت کو صحیح معنوں میں تمام شعبہائے زندگی کے تمام مواقع پر عملاً وہ اختیار، وہ حقوق اور وہ مراتب عطا کیے جن کی بدولت اسے اپنا جائز مقام حاصل ہوا بنیادی طور پر اسلام میں عورتوں کے حقوق کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اسلام میں عورت کے روحانی حقوق

اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں، ان میں سب سے پہلے عورت کے روحانی ......یعنی مذہبی...... حقوق ہیں۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

"ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فاو لئک یدخلون الجنة ولا یظلمون نقیرا" (النساء:۱۲۴)

ترجمہ: "اور جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرط یہ کہ وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگ

جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے حق میں ذرہ برابر بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی''۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام میں جنت کے حصول کے لئے جنس کی کوئی شرط نہیں بلکہ جوکوئی بھی مرد یا عورت ایمان کی حالت میں نیک عمل کرے گا، اسے اللہ تبارک وتعالیٰ جنت عطا فرمائیں گے۔ آیت بالا سے مغرب کے ان لوگوں کے اشکال کی بھی نفی ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں جنت کا تصور صرف مرد کے لئے ہے عورت کے لئے نہیں۔

دوسری جگہ سورہ احقاف میں اللہ تبارک وتعالیٰ والدین کے حقوق کے حوالے سے ارشاد فرماتے ہیں:

''ووصينا الانسان بوالديه احسٰنا حملته امه كرها ووصعته كرها وحمله وفصٰله ثلٰثون شهرا'' (الاحقاف :۱۵)

ترجمہ:''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کریں۔(اس لیے کہ) اس کی والدہ نے مشقت اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر اس کو پیدا کیا اور اس کے حمل اور دودھ کے چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے''۔

اسلام ماں بننے کے عمل کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے عورت کو اس حوالے سے انتہائی اعلیٰ اور ارفع مقام عطا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ اسلام عورت اور مرد پر یکساں اخلاقی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے اور دونوں کے لیے ایک جیسی حدود وقیود نافذ کرتا ہے۔

۲۔اسلام میں عورت کے معاشی حقوق

اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے عورت کو معاشی حقوق فراہم کیے، ان حقوق میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، مثال کے طور پر ایک عاقل و بالغ مسلمان عورت جائداد کی خرید وفروخت کرسکتی ہے، اپنے پاس رکھ سکتی ہے، ضرورت کے وقت بیچ سکتی ہے۔ وہ بغیر کسی پابندی کے اپنی مرضی سے وہ تمام فیصلے کرسکتی ہے جو ایک مرد کرسکتا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ جو حق اسلام نے عورت کو آج سے چودہ سو سال پہلے دیا، برطانیہ نے یہی حق عورت کو ۱۸۳۰ء میں آ کر دیا۔ اسی طرح اسلام نے ضرورت کے وقت عورت کے کام کرنے اور روزی کمانے کی بھی اجازت دی ہے ۔

الغرض یہ کہ اسلام نے تمام جائز کاموں کے کرنے کی عورت کو بھی اتنی ہی آزادی دی ہے جتنی کہ مرد کو، خواہ وہ طب کا شعبہ ہو یا تعلیم کا یا کوئی اور شعبہ۔

دوسری طرف اسلام تمام تر معاشی ذمہ داریاں مرد کو سونپتا ہے، عورت پر اس قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتا، ہاں اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ عورت کو اپنی ذمہ داری خود اٹھانی پڑے تو اسلام اس سے بھی منع نہیں کرتا۔ اگر حقوقِ نسواں کی محافظ شرعی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے کوئی کام کرنا چاہتی ہے تو اسلام میں اس کی بھی اجازت ہے۔ اسلام عورتوں کو کاروبار کی بھی اجازت دیتا ہے، اس سلسلے میں ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی مثال ہمارے سامنے ہے جو تجارت کیا کرتی تھیں۔

۳۔اسلام میں عورت کے معاشرتی حقوق

اسلام نے عورت کو معاشرتی اور سماجی لحاظ سے بھی کئی حقوق عطا کیے ہیں، اسے معاشرے میں ایک مہذب اور باوقار

مقام عطا کیا۔اسلام سے پہلے عہد مسیحی میں جب شرک کا دور دورا تھا،اس وقت بچیوں کے زندہ درگور کیے جانے کا رواج عام تھا،لوگ بیٹیوں کی پیدائش کو ذلت کا باعث گردانتے تھےاور بیٹیوں کے پیدا ہونے پر انہیں زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔اس وقت اسلام نے ہی رحمت بن کر عورت کو جان کی حفاظت فراہم کی اور بیٹیوں کے قتل کرنے کی قبیح روایت کا خاتمہ کیا۔

(جاری ہے)

دعا مانگنے کا ضابطہ اور اس کے آداب!

ڈاکٹر محمد عبدالعلی اچکزئی

ارشاد ربانی ہے:

''ونادیٰ نوح ربه فقال رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین، قال یا نوح انه لیس من اھلک، انه عمل غیر صالح، فلاتسئلن مالیس لک به علم، انی اعظک ان تکون من الجاھلین''۔(۱)

ترجمہ:...''اور نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے رب! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا وعدہ بالکل سچا ہے، اور تو سب سے بڑا حاکم ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کہ اے نوح! یہ شخص تمہارے گھر والوں میں نہیں، یہ تباہ کار ہے، سو مجھ سے ایسی چیز کی درخواست مت کرو جس کی تم کو خبر نہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں داخل نہ ہو جاؤ''۔

آیات مذکورہ بالا سے فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ دعا کے لئے ضروری ہے کہ دعا کرنے والا پہلے یہ معلوم کرے کہ جس کام کی دعا کر رہا ہے وہ جائز و حلال ہے یا نہیں۔ مشتبہ حالت میں دعا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، جیسا کہ قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں:

''فلاتسئلن مالیس لک به علم'' ای مالم تعلم اصواب ھو ام لیس کذلک''
(۲)

ترجمہ:...''سو مجھ سے ایسی چیز کی درخواست مت کرو جس کی تم کو خبر نہیں یعنی جس کے بارے میں تجھے یہ علم نہ ہو کہ یہ حق و جائز ہے یا نہیں''۔

مولانا محمد اشرف علیؒ لکھتے ہیں:

''وعلم به حال ادعیة مشایخ زماننا یدعون لکل ما یطلب عنھم الدعاء له حلالا کان او حراما من الخصومات او المناصب وحال دعاء بعض المشتغلین بالطریق ببعض الاحوال التی لاعلم لھم بنفعھا وضرھا''۔(۳)

ترجمہ:...''اور اس سے ہمارے زمانہ کے مشائخ کی دعاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے کہ ان سے دعووں و جھگڑوں اور عہدوں میں سے جس امر کے لئے دعا کی درخواست کی جاوے وہ اس کے لئے دعا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز، اسی طرح بعض سالکین بعض احوال کی دعا کرتے ہیں،

حالانکہ ان کا نفع ونقصان کچھ معلوم نہیں''۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے مشائخ میں جو یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی دعا کے لئے آیا' اس کے واسطے ہاتھ اٹھا دیئے اور دعا کر دی' حالانکہ اکثر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مقدمے کے لئے دعا کرا رہا ہے اس میں یہ خود حق پر ہے یا ظالم ہے یا کسی ایسے مقصد کے لئے دعا کرا رہا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں' کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے جس میں یہ حرام میں مبتلا ہوگا یا کسی کی حق تلفی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا' ایسی دعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام وناجائز ہی ہیں' اگر اشتباہ کی حالت میں بھی ہو' تو حقیقت حال اور معاملہ جائز ہونے کا علم حاصل کئے بغیر دعا کے لئے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں''۔(۴)

علامہ قرطبیؒ دعا کے آداب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ومن شرط المدعو فيه ان يكون من الامور الجائزة الطلب والفعل شرعاً''۔ (۵)

ترجمہ:...''اور یہ بھی ضروری ہے کہ دعا ان ہی چیزوں کی مانگی جائے جو عادتاً مانگی جاتی ہوں اور شرعاً مباح ہوں''۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ سے قبولیت دعا کے بارے میں یہ ارشاد منقول ہے:

''ما من احد يدعوا بدعاء الا آتاه الله ما سال او كف عنه من السوء مثله مالم يدع باثم او قطعية رحم''۔(۶)

ترجمہ:...''جو بھی شخص دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ یا تو اسے وہ چیز عطا فرما دیتا ہے جو وہ مانگتا ہے یا اس کے عوض اس سے برائی کو روک دیتا ہے' جب تک وہ گناہ کی کوئی چیز یا ناتہ توڑنے کی دعا نہیں مانگتا''۔

گناہ کی کوئی چیز مانگنے کا مطلب ملا علی القاریؒ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مثل ان يقول اللهم قدرني على قتل فلان وهو مسلم او اللهم ارزقني الخمر او اللهم اغفر لفلان وهو مات كافراً يقينا او خلد فلاناً المؤمن في النار''۔(۷)

ترجمہ:...''مثلاً کوئی شخص یوں دعا مانگنے لگے: اے اللہ! مجھے فلاں شخص کو جو مسلمان ہے' قتل کرنے کی طاقت عطا فرما' یا یوں کہے: اے اللہ! مجھے شراب عطا کر یا یوں کہے: اے اللہ! فلاں شخص کو بخش دے' حالانکہ اس کی موت یقینی طور پر کفر پر واقع ہوئی ہو یا یوں کہے: اے اللہ! فلاں مومن کو ہمیشہ عذاب جہنم میں مبتلا رکھ''۔

خلاصہ یہ کہ ایک مسلمان کو اپنے یا دوسروں کے حق میں دعا مانگنے سے قبل یہ دیکھنا چاہئے کہ جن امور کے لئے وہ دعا

مانگ رہا ہے وہ جائز بھی ہیں یا نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام سے قرآن حکیم کی زبانی بعض ایسے دعائیہ کلمات بھی منقول ہیں، جو جائز ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی پسندیدہ دعائیہ کلمات ہیں، ارشادِ خداوندی ہے:

''رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمناً وللمؤمنین والمؤمنات''۔(۸)

ترجمہ:...''اے میرے پروردگار! تو مجھے اور میرے ماں باپ اور جو بھی ایماندار ہو کر میرے گھر میں آئے اور تمام مومن مردوں اور کل ایماندار عورتوں کو بخش دیں''۔

آیت مذکورہ میں حضرت نوح علیہ السلام اپنے لئے بخشش کی طلب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اے میرے رب! مجھے اور میرے والدین کو بخش اور ہر مومن مرد و عورت کو بخش جو میرے گھر میں آ جائے، گھر سے مراد مسجد بھی لی گئی ہے، لیکن عام مراد یہی ہے پھر وہ اپنی دعا کو عام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام ایماندار مردوں اور عورتوں کو بھی بخش خواہ زندہ ہوں، خواہ مردہ۔

حافظ ابن کثیرؒ اس مقام پر لکھتے ہیں:

'ولهذا يستحب هذا الدعاء اقتداء بنوح عليه السلام''۔(۹)

ترجمہ:...''اسی لئے مستحب ہے کہ ہر شخص اپنی دعا میں دوسرے مومنوں کو بھی شامل رکھے تاکہ حضرت نوح علیہ السلام کی اقتداء ہو''۔

حافظ عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی لکھتے ہیں:

''فيه ادب عظيم من آداب الدعاء وهو جمع الوالدين والمؤمنين فی الدعاء والابتداء بنفسه''۔(۱۰)

ترجمہ:...''آیت مذکورہ میں آدابِ دعا سے متعلق ایک عظیم ادب کا بیان ہوا ہے اور وہ یہ کہ دعا میں ماں باپ اور دوسرے مسلمانوں کو بھی شریک کر لینا چاہئے اور شروع اپنے نفس سے ہو''۔

اسی طرح ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی لکھتے ہیں:

''ويستحب مثل دعا نوح اقتداء به لجميع المؤمنين والمؤمنات من الاحياء والاموات''۔(۱۱)

ترجمہ:...''اور حضرت نوح علیہ السلام کی اقتداء کرتے ہوئے اپنی دعا میں نوح علیہ السلام کی طرح تمام مسلمان مرد اور عورتوں کو شامل کرنا مستحب ہے، چاہے وہ زندہ ہوں یا مردہ''۔

حوالہ جات

۱-سورہ ہود، ۴۵، ۴۶

۲-بیضاوی، ناصرالدین عبداللہ بن محمد، تفسیر انوار التنزیل و اسرار التاویل، مطبع لکھنوی، ۱۲۸۲ھ، ۱: ۳۷۷

۳-مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ، تفسیر بیان القرآن، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، ۵: ۴۸.

۴-مفتی محمد شفیعؒ، معارف القرآن، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۹ء، ۴: ۶۳۱.
۵-القرطبی، ابی عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، قاہرہ، دار الکاتب العربی، ۱۹۶۷ء، ۲: ۳۱۱.
۶-سنن ترمذی، ابواب الدعوات، باب ماجاء ان دعوۃ المسلم مستجابۃ، حدیث نمبر: ۳۸۱.
۷-علامہ علی بن سلطان محمد القاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح، المکتبۃ الحقانیۃ، پشاور، ۱۹۹۵ء، کتاب الدعوات، الفصل الاول، حدیث نمبر ۲۲۲۷، ۵: ۹۸.
۸-سورہ نوح، ۷۱: ۲۸.
۹-علامہ ابن کثیرؒ حافظ عماد الدینؒ ابوالفداءؒ اسماعیلؒ تفسیر القرآن العظیم، لاہور، سہیل اکیڈمی، ۱۳۹۲ھ، ۴: ۴۲۸.
۱۰-حافظ عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطیؒ الاکلیل فی استنباط التنزیل، کوئٹہ، مکتبۃ اسلامیۃ، ۱۴۰۳ھ، ص: ۲۱۶.
۱۱-وہبۃ الزحیلی، التفسیر المنیر، دمشق، دار الفکر، ۱۹۹۸ء، ۲۹: ۱۵۲.

نبوی اسلوب کے حامل معلم کی رحلت

مولانا زبیر احمد صدیقی، شجاع آباد

تعلیم وتعلم ایسی انسانی ضرورت ہے، جس کے بغیر علم وآگہی ناممکن ہے، اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی تعلیم حضرت آدم علیہ السلام کو دی، پھر حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ اور انسانوں کا معلم بنایا گیا۔

خاتم الانبیاء جناب رسول اللہ ﷺ بھی معلم بنا کر بھیجے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معلم بھی بنایا اور تعلیم کے کامل اسلوب اور طریقے بھی مرحمت فرمائے۔ اس کامل اسلوب تعلیم کی برکت تھی کہ مختصر عرصے میں عرب وعجم میں علمی انقلاب برپا ہوگیا۔ دنیا ظلمت کدہ سے بقعۂ نور بن گئی، جہالت کی تاریکیاں نور علم میں بدل گئیں۔ امت میں جس کسی نے تعلیمِ نبوت پر عمل کیا، اللہ تعالیٰ نے اسے قبولیت اور ساری کائنات کی دعاؤں کا مستحق بنا دیا

حضرت مولانا اشرف شاد مانکوٹؒ بھی اسالیب نبوی کے حامل معلم تھے، ان کی پینسٹھ سالہ زندگی تعلیم وتعلم میں صرف ہوئی، ان کی شب وروز کا وظیفہ قال اللہ وقال الرسول تھا، وہ اس میدان میں حضور ﷺ کی سنتوں کے پیروکار اور متبع تھے، ان کی پوری زندگی جہد مسلسل، صبر، قناعت اور مجاہدات سے عبارت تھی، انہوں نے علوم عربیہ کے بنیادی اور اساسی علوم صرف ونحو کو اپنی محنت کا میدان بنا کر ایک بہت بڑی نرسی تیار کر کے علم کے ہزاروں باغات لگا دیئے، ان کی شبانہ روز محنتوں، شفقتوں اور مربیانہ طرز سے مدارس عربیہ سے نفرت کرنے والے مدارس سے متعلق ہو کر فضلاء بن گئے۔

حضرت مولانا اشرف شاد مانکوٹؒ میاں چنوں کے ایک دور افتادہ گاؤں چک ایل ۱۵/۵۹ میں ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر کبیروالہ ضلع خانیوال میں میدان تدریس کے مشہور شاہسوار، جامع المعقول والمنقول استاذ العلماء حضرت مولانا منظور الحقؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا منظور الحقؒ کو بے پناہ تعلیمی، تدریسی اوصاف سے نوازا تھا، وہ عقلی ونقلی علوم کے حافظ ہونے کی وجہ سے بجا طور پر علامہ معروف تھے، فن تدریس میں انہیں امام اور مجدد کا درجہ حاصل تھا، صرف، نحو، منطق اور فلسفہ میں انہیں امتیازی طور پر کمال حاصل تھا، مدارس دینیہ میں مذکورہ بالا فنون خشک اور دقیق سمجھے جاتے ہیں، بایں وجہ طلباء کی عموماً ان فنون سے دوری رہتی ہے، حضرت مولانا منظور الحقؒ کے علمی کمال اور خصوصی ملکۂ تدریس کی وجہ سے طلباء کو ان فنون سے بجائے وحشت کے نہ صرف موانست ہوتی، بلکہ طلباء کی دل لگی کا ذریعہ ہی یہی فنون ہوتے۔

حضرت مولانا منظور الحقؒ نے اس نووارد طالب علم... حضرت مولانا اشرف صاحبؒ... کو اپنی دوربین نگاہوں سے بھانپ لیا کہ یہ سیپ مستقبل قریب میں گوہر یکتا ہوسکتا ہے، اسی وجہ سے حضرت مولانا محمد اشرفؒ کو خصوصی توجہات اور شفقتوں اور محبتوں سے نوازنا شروع فرمایا، نتیجۃً حضرت مولانا محمد اشرفؒ اپنے استاذ محترم سے کسب فیض کرتے کرتے ان کا عکس اور ان کے علوم کے

ترجمان بن گئے اور بجا طور پر وہ مستقبل میں حضرت مولانا منظور الحقؒ کے علمی جانشین کہلائے۔ حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ نے اپنی تعلیم کی تکمیل بھی اپنے استاد محترم حضرت مولانا منظور الحقؒ کی زیرسرپرستی دارالعلوم کبیر والا میں فرمائی۔

دارالعلوم کبیر والا میں آپ کو ایک سے بڑھ کر ایک یکتائے زمانہ صاحبِ تقویٰ صاحبِ فراست اور صاحبِ علم اساتذہ کی صحبت اور شرف تلمذ نصیب ہوا' حضرت مولانا منظور الحقؒ کے علاوہ ان کے برادر اکبر حضرت علامہ مولانا ظہور الحقؒ' حضرت مولانا سید فیض علی شاہؒ شیخ الحدیث حضرت مولانا علی محمدؒ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید دامت برکاتہم العالیہ' شیخ الحدیث حضرت مولانا صوفی محمد سرور صاحب مدظلہم جیسے اساتذہ نے اس سونے کو کندن بنا کر نمایاں کر دیا' چنانچہ حضرت مولانا محمد اشرف شادؒ ۱۳۷۰ھ میں سند فراغت حاصل کرنے کے بعد کبیر والا کے قریب ہی قصبہ ٹھوکر چاون میں اپنے اساتذہ کرام کے مشورہ سے محو تدریس ہو گئے' آپ کی تدریسی محنت اس درجہ تک پہنچی کہ آپ کے استاد محترم حضرت مولانا منظور الحقؒ جو اس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے نے فرمایا کہ: مولانا محمد اشرف جیسے لائق مدرس کو تو دارالعلوم میں ہونا چاہئے' چنانچہ ۱۳۷۱ھ میں دارالعلوم کبیر والہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ یہاں دارالعلوم میں تقرری کے ساتھ ہی حضرت مولانا منظور الحقؒ نے تعلیم صرف ونحو میں گویا آپ کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے صرف ونحو کی تدریس بھی آپ کے سپرد کر دی' اس وقت سے وفات تک آپ کا اڑتیس سالہ دور تدریس ہے' ان اڑتیس سالوں میں حضرت نے دارالعلوم کبیر والا ٹھوکر چاون شورکوٹ' جہانیاں منڈی شجاع آباد اور مانکوٹ میں علمی جوہر بکھیرے۔

حضرت بہلویؒ بھی آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے' یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنی صاحبزادی حضرت کے نکاح میں دیدی۔ یوں آپ بہلوی نسبت کے بھی حامل ہو گئے' حضرت بہلویؒ آپ سے بے حد محبت اور شفقتوں سے نوازتے' اس کے بعد آپ مدرسہ اشرف العلوم شجاع آباد میں قطب الارشاد حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلویؒ کے حکم سے تدریس کے لئے تشریف لائے' اور حضرت کی توجہات کا مرکز رہے۔

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب اپنی تدریسی خصوصیات کی وجہ سے محبوب المشائخ والعلماء تھے' پاکستان کے نامور علماء کرام اور مشائخ عظام اپنے صاحبزادگان کی تعلیم وتربیت کے لئے حضرت مولانا کا انتخاب فرماتے۔

آپ محبوب العلماء والمشائخ تو تھے ہی' طلباء دین بھی آپ پر نثار رہتے۔ باوجود یہ کہ آپ ایک سخت گیر معلم اور مربی تھے۔ عام درسگاہوں میں جو چیزیں قابل اعتنا نہیں سمجھی جاتیں' حضرت کے ہاں وہ قابل مواخذہ جرم ہوتیں اور اس پر سخت دارو گیر ہوتی۔ سبق میں ذراسی کوتاہی' مطالعہ وتکرار میں عدم دلچسپی پر ہر طالب علم کا ایسا مواخذہ ہوتا کہ آئندہ کسی طالب علم کو ایسی کوتاہی کی جرأت نہ ہوتی۔ بایں ہمہ آپ کی شفقت آپ کی شدتوں پر غالب آجاتی اور آپ طالب علموں کے دلوں کو موہ لیتے۔

راقم الحروف کی تدریس بھی حضرت کی شفقتوں کا نتیجہ ہے' احقر ۱۹۸۹ء میں دورہ حدیث سے فارغ ہوا تو حضرت مولانا محمد اشرفؒ نے حضرت والد محترم حضرت مولانا رشید احمدؒ سے تقاضا فرمایا کہ: مولوی زبیر کو میرے حوالے کر دو، اور وہی سال جامعہ اشرفیہ مانکوٹ کے قیام کا تھا۔ حضرت کی شفقتوں اور حضرت کی عطاء کردہ تعلیمی تدریسی مئے نے ایسا مدہوش کیا کہ زندگی کے سب سے یادگار اور خوشگوار ایام بھی مانکوٹ کے ہی بن گئے' یہ حضرت کی شفقت تھی کہ شہروں میں پیدا ہونے والے' پنکھوں' ایئرکولروں اور اے سی میں زندگی گذارنے والے' اسی طرح انگلینڈ اور امریکہ کے ماحول میں آنکھیں کھولنے والے اس جنگل میں حضرت کی

محبت اور شفقت کی وجہ سے سالہا سال علمی پیاس بجھاتے رہے۔

آپ نے اپنے اندر تعلیم کے وہ اسالیب اختیار فرمائے جو معلم کامل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے صادر ہوئے۔ ذیل میں چند ایسے اسالیب کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

کمال علم

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب نے اپنے اندر کمال علم کو پیدا فرمایا' وہ حافظ قرآن بھی تھے اور سبعہ عشرہ کے قاری بھی' وہ ماہر عقلیات بھی تھے اور نقلیات بھی' تقسیم اسباق کے وقت ہر مشکل سبق وہ اپنے ذمے لے لیتے۔ انہوں نے اپنی تدریس کے آغاز میں ہی اقلیدس' چغمینی' شمس بازغہ جیسی کتابیں پڑھنا شروع کر دی تھیں' عبدالغفور شرح جامی' کافیہ ہدایۃ النحو' ارشاد الصرف' زرادی' زنجانی اور فصول اکبری جیسی کتابوں کے تو وہ حافظ تھے' ان میں سے بیشتر کتب تو تقریباً پینتیس مرتبہ وہ باقاعدہ پڑھا چکے تھے۔ ارشاد الصرف جیسی کتب تو سال میں کم از کم دو مرتبہ پڑھاتے' یوں صرف کی تدریس کا انہیں کم وبیش ایک سو بار موقع ملا ہوگا۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں حضرتؒ' راقم الحروف کے والد محترم حضرت مولانا رشید احمدؒ بانی جامعہ فاروقیہ شجاع آباد کی رفاقت میں تحریک کے زخمی کارکنان کی عیادت کے لئے ہسپتال جاتے ہوئے دھر لئے گئے' چنانچہ شجاع آباد تھانہ میں جھوٹا مقدمہ دائر کر کے ان حضرات کو سنٹرل جیل ملتان بھیج دیا گیا' مجھے حضرت نے ایک سے زائد بار فرمایا کہ: جیل میں ہم دونوں ....والد محترم واستاد محترم ....اولاً قطبی کا تکرار اور پھر صحیح بخاری کا تکرار کرتے رہے' یہ ان حضرات کے علمی استحضار کا بین ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس قدر علم سے نوازا تھا اور انہیں علم سے کس حد تک پیار تھا۔

کمال تقویٰ:

مقبول علم وہی ہوتا ہے جو باعث عمل ہو' جناب رسول اللہ ﷺ نے اس علم سے پناہ چاہی ہے جو نفع مند نہ ہو' حضرت مولانا محمد اشرفؒ کو اللہ تعالیٰ نے سراپا عمل اور تقویٰ بنایا تھا' ان کی عفت و پاکدامنی اس قدر تھی کہ وفات تک ان پر ذرا بھی دھبہ نہ آیا' احتیاط اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ درسگاہ میں ...ایام جوانی میں...دروازے میں تشریف رکھتے' تاکہ کوئی بے ریش طالب علم سبق پوچھنے آئے تو سب کے سامنے ہو اور موضع تہمت نہ بنے' کبھی تنہا کمرے میں ہوتے تو کسی بھی چھوٹے طالب علم کو کمرے میں داخلے کے لئے اجازت نہ ہوتی' حکم ہوتا کہ کسی اور طالب علم کو ساتھ لے کر آؤ' نماز کی امامت زمانہ مرض تک خود کرواتے رہے اور فرماتے: میں خود جماعت اس لئے کرواتا ہوں کہ میری نماز تکبیر تحریمہ کے ساتھ ادا ہو جائے' بغیر کسی شرعی عذر کے شاید برسہا برس تک آپ کی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوئی۔ حفظ قرآن کے زمانہ سے لے کر وفات سے ایک سال قبل تک تراویح میں ختم قرآن ہر سال کا معمول رہا اور یہ معمول کسی سال نہیں چھوٹا۔ صرف آخری سال مرض اور ضعف کی کثرت کی وجہ سے یہ معمول پورا نہ ہو سکا' یقیناً اس سال کے ختم قرآن سنانے کا ثواب بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ضرور مرحمت فرمایا ہوگا۔ حفاظ طلباء کو اکثر ہر سال تراویح میں قرآن سنانے کی تاکید فرماتے اور ختم قرآن پر پیسے لینے کی سخت ممانعت فرماتے' اور یہی انہیں اپنی والدہ محترمہ کی نصیحت تھی۔ نماز تہجد کی ادائیگی کا بھی ہمیشہ سے معمول تھا' عموماً رات کو صرف کے سبق سے بارہ بجے فارغ ہوتے' صبح تہجد کے لئے اٹھ جاتے' سفر وحضر میں تہجد کا یہ معمول جاری

رہتا' بسا اوقات سفر سے رات دو بجے تشریف لاتے' تب بھی صبح چار بجے حسبِ معمول تہجد کے لئے اٹھ جاتے' زندگی بھر مدرسہ میں مہمانوں پر مدرسہ کا خرچ کرنے کی بجائے اپنی گرہ اور جیب سے مہمان نوازی کی' جامعہ کے مہمانوں کی خدمت بھی اپنے گھر سے فرماتے' طلباء کے والدین' مدرسہ کے معاونین اور زائرین سب ہی کے لئے آپ کا دسترخوان بچھا رہتا' وفات سے قبل اپنی بیوہ سے بھی یہی وصیت فرمائی کہ میرے بعد میرے مہمانوں کا خیال رکھنا۔

تقویٰ کا یہ عالم تھا' فرماتے کہ: میں نے پوری زندگی کبھی بھی مدرسہ کے مہتمم صاحب سے تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ نہیں کیا اور کبھی مہتمم صاحب نے از خود اضافہ فرما دیا تو میں نے شکریہ ادا نہیں کیا' تاکہ اس سے بھی طمع اور خواہش کی جڑ کٹ جائے۔ ذکر اللہ کا بھی دائمی معمول تھا' اپنے معمولات ہمیشہ پورے فرماتے' ذکر اللہ کے سلسلہ میں آپ مختلف مشائخ سے راہنمائی لیتے رہے' سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت مولانا غلام حبیب نقشبندیؒ سے آپ مجاز ہیں' ذکر اللہ کا سلسلہ وفات تک جاری رہا' حضرت کے صاحبزادگان کے بقول شہادۃ کی انگلی سے انگلیوں کی گرہوں پر وظائف پڑھنے کا معمول تھا' چنانچہ وفات تک زبان بھی متحرک رہی اور انگلی بھی حرکت کرتی رہی۔

طلبہ کی خیر خواہی:

متعلمین کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی ہمدردی نہ صرف اپنی ذات تک محدود تھی' بلکہ امت کے علماء کو طلاب دین کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی کرتے رہنے کی آپ نے تاکید فرمائی۔

حضرت مونالا محمد اشرف صاحب اپنی حقیقی اولاد سے بڑھ کر اپنی روحانی اولاد کی خیر خواہی فرماتے' وہ زیادہ تر وقت طلباء کرام میں ہی گزارتے' نماز صبح سے لے کر دوپہر تک پھر ظہر سے لے کر رات بارہ بجے تک ان کا وقت طلباء کے افادہ میں گزرتا' طلباء کی خیر خواہی میں اس قدر حریص تھے کہ سترہ سترہ اسباق روزانہ پڑھاتے۔ اپنی تدریس کے پہلے سال حضرت کو تسہیل المبتدی سے لے کر میبذی' شرح عقائد تک خود اسباق پڑھاتے دیکھا ہے' نماز عصر کے بعد مدرسہ میں طلباء اور اساتذہ سیر و تفریح کے ذریعہ ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں' لیکن راقم نے عصر کے بعد بھی حضرت کو طلباء کی علمی تشنگی بجھاتے دیکھا۔

طلبہ کی خیر خواہی کا یہ عالم تھا کہ بعض طلباء کا کھانا اپنے گھر سے جاری فرما دیتے' اکثر اوقات پوری کلاس کو مستقلاً چائے تک پلاتے رہتے' کسی کی گھریلو پریشانی معلوم ہو جاتی تو حتی الوسع اس کو دور کرنے یا حل کرنے کی کوشش فرماتے۔

مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء کو اکثر مدارس میں تدریس کے لئے جگہ بنا کر دیتے اور پوری پوری سرپرستی فرماتے' ملک بھر میں امتحانات کے لئے مدارس میں تشریف لے جاتے اور اپنے تلامذہ کے اسباق کا خصوصیت سے امتحان لیتے' اگر اسباق میں کوتاہی محسوس ہوتی تو تلامذہ سے سخت دار و گیر فرماتے' حضرت مولانا محمد اشرفؒ کی شفقت کو دیکھ کر طلباء والدین اور گھروں کو بھول جاتے' ناز و نعم میں پلنے والے ان کے دامن شفقت میں آ کر شہری زندگی کو خیر باد کہہ کر برسہا برس تک حضرت کے ساتھ دیہات میں مقیم رہے۔

حسن اخلاق:

حسن اخلاق بھی وصف نبوی ﷺ ہے' قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھا کر آپ کے اخلاق عالیہ کی بلندی کا ذکر

فرمایا ہے' افادہ اور استفادہ بھی حسن اخلاق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ استاذ محترم حضرت مولانا محمد اشرف پیکر اخلاق تھے' ان سے ملاقات کرنے والا انہیں اپنا پرانا ملنے والا سمجھتا' حالانکہ وہ پہلی ملاقات ہوتی' وہ ہر آنے والے کے دل کو موہ لیتے' ہر کسی کو وقت مرحمت فرماتے' طلباء کرام سے گفتگو بھی نہایت شفقت بھرے لہجہ میں ہوتی ''میرے عزیز'' ان کا تکیہ کلام تھا۔ طلباء کو کوتاہیوں پر تنبیہ کے بعد شفقت بھرے لہجہ میں ''میرے عزیز'' فرماتے تو دل سے غم وغصہ کافور ہو جاتا' آپ کے حسن اخلاق کی وجہ سے پورا علاقہ آپ کا گرویدہ اور ثناء خوان ہے' غریب امیر سب ہی سے آپ کا تعلق یکساں تھا' اور سب ہی آپ سے محبت کرتے۔

ملکۂ تفہیم:

کامل استاذ وہی ہوتا ہے جو اپنی بات آسانی کے ساتھ اپنے تلامذہ کو ذہن نشین کرادیں' حضرت مولانا محمد اشرف صاحب کا یہی کمال تھا کہ وہ مشکل سے مشکل مضمون' دقیق علمی مباحث کو نہایت ہی بے تکلفی کے ساتھ اس طرح بیان فرماتے کہ طلباء نہ صرف سمجھ جاتے' بلکہ فوراً یاد بھی کر لیتے' صرف ونحو کی گتھیوں کو سلجھانا ان کے لئے معمولی کام تھا' مشکل صیغہ جات کو مزاح کے انداز میں حل کرا دیتے' ان کے نرالے انداز تفہیم کی وجہ سے ان کے درس میں شریک طلباء کبھی اکتاہٹ محسوس نہ کرتے' کافیہ' شرح جامی جیسی کتب کی مشکل مباحث اور ضروری فوائد کو سوال وجواب اور تمہیدی باتوں کے عنوان سے معنون کر کے بیان کرتے تو کتابیں حل ہو جاتیں۔

سیرت سازی:

تعلیم وتعلم سے مقصود سیرت' کردار سازی اور عمل ہوتا ہے' حضرت استاذ محترم طلباء کی سیرت سازی پر زور دیتے' آپ کے اسباق میں موعظت کے لئے ایک حصہ مقرر ہوتا' خدمت دین متین اور اس مقصد کے لئے تحمل' شدائد ومصائب کا جذبہ طلباء میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے' علماء کے لئے سرکاری ملازمتوں کے اختیار کرنے کو سخت ناپسند کرتے' طلباء کو اس سے منع فرماتے۔

صرف کے مبتدی طلباء کو ایک عہد نامہ تحریر کرواتے' گویا یہ طلباء کا اپنے استاذ سے معاہدہ ہوتا کہ وہ زندگی بھر دین کی خدمت کریں گے' سرکاری ملازمت ہرگز اختیار نہیں کریں گے۔ طلباء میں اکثر اسلاف واکابر کے واقعات بیان فرماتے' اور اکابر پر اعتماد کرنے کا درس دیتے' انہیں سلف بیزاری سے سخت نفرت تھی' جو لوگ اسلاف کی راہ چھوڑ کر نئی راہیں اختیار کر چکے ہیں' ان سے اعلانیہ اظہار برأت فرماتے۔ ایک مرتبہ احقر کو پیغام بھیجا کہ ''مدال'' میں سلف بیزاری کا فتنہ سر اٹھا رہا ہے' آ کر بیان کرو' بندہ حاضر ہوا' اور حضرت پورے بیان میں خود تشریف فرما ہوئے اور دعاؤں سے نوازتے رہے۔

طلباء کو تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز کی ادائیگی' تلاوت قرآن اور نماز تہجد کی تلقین فرماتے' آپ نے اپنی اولاد کو بھی اسی رنگ میں رنگا' چنانچہ چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی بحمد اللہ حافظ' قاری اور عالم ہیں' اپنے والد کے لئے صدقہ جاریہ ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگیں جو پنہاں ہوگئیں

نقد و نظر

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

(ادارہ)

تفسیر عثمانی

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، صفحات: ۸۶۰، قیمت: درج نہیں، پتہ: اقرأ اشرفیہ کمپنی، فرسٹ فلور زبیدہ سینٹر ۴۰، اردو بازار لاہور۔

شیخ الہند حضرت اقدس مولانا محمود حسن دیوبندی، اسیر مالٹا، قدس سرہ نے دورانِ اسارت قرآن کریم کے ترجمہ کے بعد تفسیر کا کام جس اخلاص سے شروع فرمایا تھا، اسی کا ثمرہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کے تلمیذِ رشید حضرت عثمانی قدس سرہ نے اپنے شیخ کی طرز پر اس کی تکمیل فرمائی، جسے ایسی قبولیت عامہ نصیب ہوئی کہ شاید و باید۔

پیش نظر تفسیر عثمانی بھی اسی تسلسل کا جدید ایڈیشن ہے، جسے منفرد انداز اور اضافہ عنوانات کے ساتھ عمدہ شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ تفسیر عثمانی کی عظمت و رفعت کو وہی لوگ جانتے ہیں جو متداول تراجم و تفاسیر سے واقف ہیں۔ اس لئے اگر غور کیا جائے تو تفسیر عثمانی تمام متداول اردو، عربی تفاسیر کا اختصار و خلاصہ ہے۔

اربابِ علم و دانش جانتے ہیں کہ تفسیر عثمانی ''دریا بکوزہ'' کا مصداق ہے، چنانچہ جو شخص پہلے تمام متداول اردو، عربی تفاسیر کا بغور مطالعہ کرے اور پھر تفسیر عثمانی کا مطالعہ کرے تو اسے اس کی ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک حرف کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ یہاں سے کس تفسیر کے کس قول، اعتراض یا اشکال کا جواب اور مختلف تفسیری اقوال میں سے کس کو ترجیح دی جا رہی ہے، اس تفسیر کی اسی جامعیت اور مقبولیت کا نتیجہ اور ثمرہ ہے کہ اس تفسیر کو ہمیشہ قبول عام کا شرف حاصل رہا ہے اور اس کو مختلف اداروں اور مکتبوں نے نہایت ہی شاندار انداز سے شائع کرنے اور امت تک پہنچانے کی سعادت حاصل کی ہے، حتیٰ کہ سعودی عرب کے ''مجمع ملک فہد'' کی جانب سے اسے لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے دنیا بھر میں پہنچانے کا انتظام کیا گیا، اسی طرح دار التصنیف تبلیغی کالج کراچی، مکتبہ علوم شرعیہ کراچی، دار الاشاعت کراچی اور دیگر بے شمار اداروں نے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اور اب اقرأ اشرفیہ کمپنی لاہور نے اسے جدید انداز اور نئے عنوانات کے ساتھ اس طرح شائع کیا ہے کہ تفسیری مواد کو قرآن کریم کے متن کے اوپر لکھنے کے بجائے دائیں، بائیں اور نیچے کی جانب لکھ کر قرآن کریم کے آداب کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس سب کے علاوہ اس کے تفسیری حواشی کے ہر صفحے کے پہلے حاشیہ کو اس کے متعلقہ صفحہ کے شروع میں درج کرتے ہوئے اس کے بقیہ کو آخر میں لے جایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حواشی نمبرات کو محرابی شکل میں نمایاں کیا گیا ہے جب کہ عنوانات کو جلی قلم سے لکھ کر نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب استاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے اس ایڈیشن

کی خصوصیات کو اپنے پیش لفظ میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ا:......پہلی مرتبہ فوائد عثمانی پر ۴۷۲۴۳ عنوانات جدیدہ کے مستند اضافہ کے ساتھ...جن کو الگ طرز خط لگا کر فوائد سے جدا بھی کر دیا گیا ہے، جس کے لئے جامعہ اشرفیہ کے استاذ عزیزم مولوی محمد ظفر سلمہ نے محنت شاقہ برداشت کی...پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

۲:......تفسیری حاشیہ میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ تفسیر ''متن قرآن'' کے اوپر نہ ہو، بلکہ دائیں اور نیچے ہی رہے۔

۳:...... ہر صفحہ کو اسی صفحہ کے متن کے فائدہ نمبر (۱) سے شروع کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر صفحہ کے فوائد اسی میں مکمل ہو جائیں، اگر مضمون صفحہ کی وسعت سے بڑھ رہا ہو تو اسے اگلے کسی صفحہ کے آخر میں لکھ دیا گیا ہے، اور اس بقیہ کو انڈر لائن دے کر موجودہ صفحہ کی تفسیر سے الگ کر دیا گیا ہے، تاکہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔

۴:...... ہر صفحہ پر حاشیہ کے اندر فائدہ نمبروں کو محرابی دائرہ لگا کر واضح کر دیا گیا ہے، تاکہ مطالعہ کرنے میں دقت نہ ہو۔

۵:......ان خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب آپ مختصر وقت میں ایک پارہ مع ترجمہ و تفسیر بآسانی مطالعہ کر سکتے ہیں جو پہلے ناممکن تھا۔''

بلاشبہ یہ ایڈیشن اپنے حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ ہے، امید ہے اہل ذوق اس کی قدر دانی میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔

البشیر والنذیر ترجمہ و تشریح الترغیب و الترھیب:

جلد اول و دوم، ترجمہ: مولانا محمد عثمان مقیم مدینہ منورہ، صفحات: جلد اول: ۹۷۷، جلد دوم: ۸۵۲، قیمت: عام قیمت ۱۰۰۰ روپے، پتہ: زمزم پبلشرز شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی۔

حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری اور ان کی کتاب الترغیب والترہیب حلقہ اہل علم میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حافظ منذریؒ چھٹی صدی کے عظیم محدث اور چوٹی کے علماء میں سے تھے، آپ نے اپنے ایک شاگرد کی خواہش و درخواست پر ترغیب و ترہیب املا کرائی، جس میں انہوں نے اسناد و علل کی ابحاث سے صرف نظر کرتے ہوئے ترغیب و ترہیب کی احادیث جمع فرمائیں، اگر چہ انہوں نے اپنی کتاب میں فضائل کی احادیث کو جمع کیا ہے اور اس پر صحیح و ضعیف تمام قسم کی روایات جمع فرمائی ہیں، مگر بایں ہمہ آپ نے ضعیف روایات کی نشاندہی بھی فرمادی ہے۔

بلاشبہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قبولیت عامہ نصیب فرمائی کہ اپنے زمانہ تصنیف سے آج تک وہ حلقہ اہل علم میں مقبول و مشہور ہے۔

ضرورت تھی کہ امت کو اعمال پر لانے، گناہوں سے بچانے، اردو داں طبقہ اور عوام و خواص کو اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا محمد عثمان صاحب کو جنہوں نے حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہریؒ کی

خواہش، تمنا اور ترغیب وتحریص پر اس کا ترجمہ کیا اور اس کی ضروری تشریح اور وضاحت کر کے ایک بہت بڑا مفید علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔

موصوف نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ: ایسی تمام احادیث جو سند کے اعتبار سے کمزور اور ضعیف تھیں، ان کو حذف کر دیا گیا ہے، صرف صحیح اور حسن احادیث کو لیا گیا ہے، اور جہاں مصنف نے کسی حدیث کی سند پر بحث کی ہے، اس کو اصل عربی حالت میں باقی رکھا ہے، جو حدیث مکرر آئی ہے، اس کے تکرار کو حذف کر دیا گیا ہے اور جہاں کسی تشریح اور وضاحت کی ضرورت تھی، وہاں وضاحت اور تشریح کر دی گئی ہے، اصل کتاب چار حصوں پر مشتمل تھی، چنانچہ اس کے ترجمہ کے بھی چار اجزا ہیں۔

اس ترجمہ وتشریح کی ثقاہت واعتماد کے لئے یہی کافی ہے کہ اس پر حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلندشہری قدس سرہ جیسے نابغۂ علم کا مقدمہ اور تقریظ ہے۔

یہ کتاب اس سے قبل بھی مختلف اجزاء میں شائع ہوئی تھی، جدید ایڈیشن میں اس کی دو ضخیم جلدوں پر تقسیم کیا گیا ہے اور اس کی سابقہ اغلاط کی تصحیح کا اہتمام کیا گیا ہے، ہر ہر حدیث میں نمبر لگائے گئے ہیں، اصل کتاب اور ترجمہ کے نمبرات کو واضح کرنے کے لئے دو قسم کے نمبر لگائے گئے ہیں۔

بلاشبہ جو لوگ اپنی روزمرہ زندگی کو اسوۂ نبوی میں ڈھالنے کے خواہش مند ہیں، یہ کتاب ان کے لئے خوان یغمیٰ ہے اور جو لوگ اللہ کی ناراضی اور غضب سے بچنا چاہتے ہیں، ان کے لئے کسی تریاق سے کم نہیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے زمزم پبلشرز کے اربابِ حل وعقد کو جنہوں نے یہ سوغات امت تک پہنچانے کا انمول کارنامہ انجام دیا ہے۔ کتاب کے ٹائٹل پر کتاب کا بایں الفاظ تعارف کرایا گیا ہے:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث مبارکہ کا عربی متن وترجمہ اور ضروری فوائد کے ساتھ فضائل کا مستند ذخیرہ، جس میں نیک اور بھلے اعمال پر دنیا وآخرت میں فوائد اور کوتاہی سے آنے والے نقصانات کا ذکر ہے، جس کے پڑھنے سے ایک مسلمان کے دل میں نیکیوں کی رغبت اور گناہوں کی نفرت بیٹھتی ہے۔''

الغرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان کے گھر میں ہونی چاہئے اور اس کی گھر گھر میں باقاعدہ تعلیم ہونی چاہئے۔

خطبات ومقالات شیخ الاسلام حضرت اقدس سیّد حسین احمد مدنی، سیمینار بہاولپور:

باہتمام: مولانا مفتی سیّد محمد مظہر اسعدی، صفحات: ۳۷۴، قیمت: درج نہیں، پتہ: شیخ الاسلام اکیڈمی جامعہ سیّدنا اسعد بن زرارہ گلشن اقبال حاصل پور روڈ، بہاولپور۔

پیش نظر مجموعہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، شیخ الاسلام سیمینار کے ان مقالات وخطبات کا مجموعہ ہے جو ۲۴/ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ مطابق ۶/ مارچ ۲۰۰۵ء کو بہاولپور میں منعقد ہوا، اور جس میں ہندوپاک کے اکابر نے شرکت کرتے ہوئے اپنے مقالات اور خطبات پیش فرمائے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جناب مولانا مفتی محمد مظہر اسعدی کو جنہوں نے اس گئے گزرے دور میں حضرت شیخ الاسلام کی

حیات وخدمات کواجاگر کرنے کے لئے یہ اہتمام کیااور ہندو پاک کے اکابر، اہلِ علم اوراصحابِ تحقیق کوجمع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ چنانچہ بعد میں ان کومرتب کر کے خوبصورت کتاب کی شکل دے دی گئی اوراب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔حضرت مدنی قدس سرہ کی حیات وخدمات اوران کی انتھک محنت وجدوجہد کا تقاضا تھا کہ نئی نسل کواس سے روشناس کرایا جائے ،امید ہے اس سعی وکوشش سے نئی نسل کوبیش بہافائدہ ہوگا۔

تسہیل البخاری

امیر المومنین مجدد ملۃ شیخ القرآن والحدیث مولانا عبدالہادی دیو بندیؒ شاہ منصور،صفحات: ۲۴۸، قیمت: درج نہیں، پتہ: دارالتصنیف والتالیف دارالعلوم تعلیم القرآن شاہ منصور تحصیل وضلع صوابی،سرحد۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ صحیح بخاری کی تسہیل ہےاوراس پر مصنف موصوف نے نہایت اختصار سے صحیح بخاری کی منتخب اورمشکل ابحاث کی اشارات میں تسہیل کی ہے۔

کتاب کے تعارف اورمقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف موصوف حضرت اقدس مولانا حسین علی واں بچھراں قدس سرہ کے شاگرد وتلمیذ ہیں اوران پر حضرت موصوف کی تحقیقات کا رنگ غالب ہے۔ یہ کتاب خالص تدریسی فوائد پر مشتمل ہے، ایسے حضرات جوصحیح بخاری کی تدریس کے شرف سے مشرف ہوں، وہ اس سے استفادہ فرما سکتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف علام نے طویل عرصہ تک صحیح بخاری کا درس دیا ہے، لہٰذا ان کا کلام ’’خیرالکلام ماقل ودل‘‘ کا مصداق ہے، اورصرف منتہی طلبہ یا اساتذہ کے لئے نفع بخش ہے۔ بہرحال کتاب میں حضرت مولانا حسین علی قدس سرہ کی تحقیقات اورذوق کا رنگ غالب ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کی مزید تسہیل کے لئے متعلقہ ابحاث اوراحادیث بھی درج کردی جاتیں اوران پر فقہی اورحدیثی ابحاث کوزیادہ مرتب ومدون انداز میں شائع کیا جاتا۔